صحیح مسلم کی خصوصیات

مع بعض احادیث کی تشریح وتخریج

مؤلف

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری

استاذ حدیث کلیۃ الشریعہ واصول الدین

وعمید کلیۃ الدعوۃ والإعلام، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ناشر

جمعیۃ المعارف الإسلامیۃ

ٹیگور مارگ، نزد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

جمادی الاولیٰ ۱۴۴۶ھ-نومبر ۲۰۲۴ء

نام کتاب	:	صحیح مسلم کی خصوصیات مع بعض احادیث کی تشریح وتخریج
مؤلف	:	مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری
صفحات	:	۲۱۲
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
طباعت	:	ورک لائن پریس، لکھنؤ
کمپوزنگ	:	عبدالرحیم ندوی
قیمت	:	۲۰۰/روپے

ناشر

جمعیۃ المعارف الإسلامیۃ

ٹیگور مارگ، نزد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 9984778800

E-mail: JMI_LKO@YAHOO.CO.IN

فہرست مضامین

''صحیح مسلم کی خصوصیات''

مع بعض احادیث کی تشریح وتخریج

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	مقدمہ: مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۶
۲	تقریظ: مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۸
۳	تأثرات: مولانا محمد عاقل مظاہری	۱۱
۴	تقریظ: مولانا قمر الحسن القاسمی الازہری	۱۳
۵	پیش لفظ: مولانا نیاز احمد ندوی	۱۶
۶	ریویو برخصوصیات صحیح مسلم: مولانا ابوسحبان روح القدر ندوی	۲۰
۷	دعائیہ کلمات: محمد یونس میمن مقیم جدہ (سعودی عرب)	۲۳
۸	گزارشات: مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۲۴
۹	علم حدیث	۳۰
۱۰	حدیث کے لغوی معنی	۳۰
۱۱	لغوی اصطلاحی معنی میں ربط	۳۰
۱۲	حدیث کے مترادفات	۳۲
۱۳	علم حدیث	۳۳
۱۴	علم حدیث کی تعریف	۳۴

۱۵	روایت ودرایت کی تعریف	۳۵
۱۶	حدیث کی کسوٹی	۳۶
۱۷	نقدحدیث	۳۷
۱۸	اسانید کی جانچ	۳۷
۱۹	فن درایت	۳۸
۲۰	حدیث کے متقارب الفاظ	۴۵
۲۱	اقسام حدیث اوران کا ماخذ ''قرآن''	۴۷
۲۲	صحاح ستہ کی شرطیں اورفرق مراتب	۵۱
۲۳	صحاح ستہ کے مقاصد	۵۵
۲۴	کتب حدیث کی قسمیں	۵۷
۲۵	تحمل حدیث کی قسمیں	۵۹
۲۶	تدوین حدیث کب اورکس طرح	۶۲
۲۷	دورتابعین میں	۶۸
۲۸	مدونِ اوّل کون؟	۷۰
۲۹	دوسری صدی	۷۱
۳۰	تیسری صدی	۷۳
۳۱	حفاظت حدیث کے اسباب	۷۴
۳۲	تابعین میں حفظ حدیث کا جذبہ	۷۹
۳۳	حدیث کی اہمیت	۸۰
۳۴	حجیۃ حدیث	۸۲

۳۵	رسول اللہ ﷺ کا صحیح مقام	۱۱۳
۳۶	باعتبار صحت، حدیث کی کتابوں کے طبقات	۱۲۲
۳۷	احادیث کے راویوں کے طبقات	۱۲۶
۳۸	احادیث کی تصحیح وتضعیف کے اصول وقواعد	۱۲۹
۳۹	صحیح مسلم	۱۳۶
۴۰	صحیح مسلم کے تراجم ابواب	۱۳۸
۴۱	صحیح مسلم کی شروحات	۱۳۹
۴۲	صحیح مسلم کے مستخرجات	۱۴۲
۴۳	تلخیصات صحیح مسلم	۱۴۲
۴۴	صحیح مسلم کا مقام اور اس کا امتیاز	۱۴۳
۴۵	صحیح مسلم کی امتیازی خصوصیات	۱۴۳
۴۶	شرائط مسلم	۱۴۸
۴۷	شرائط مسلم پر چند اشکالات	۱۴۹
۴۸	کیا مسلم کی سبھی حدیثیں صحیح ہیں	۱۵۱
۴۹	مسلم میں ضعیف راوی کی روایت	۱۵۳
۵۰	الجرح مقدم علی التعدیل	۱۵۳
۵۱	حدیث عنعنہ میں شیخین کا اختلاف	۱۵۴
۵۲	امام مسلم رحمہ اللہ	۱۵۶
۵۳	باب: صحیح مسلم کی بعض احادیث کی تخریج	۱۵۹
۵۴	حدیث: ۱-۱۰	۱۶۰-۲۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء وامام المرسلین محمد، وعلی آلہ وصحبہ ، ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین ، أما بعد:

پیش نظر کتاب (صحیح مسلم کی خصوصیات) دار العلوم ندوۃ العلماء کے موقر استاذ حدیث جناب مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری نے تصنیف کی ہے، مولانا نے ادھر تصنیفی میدان میں قدم رکھا ہے، اور ماشاء اللہ متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں، جو عوام وخواص میں مقبول ہیں، اور اہل علم ان کو پڑھتے اور ان سے معانی ومفاہیم أخذ کرتے ہیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کر کے عملی زندگی کو قابل رشک بناتے ہیں۔

مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری کی ایک کتاب سید المحدثین امیر المؤمنین فی الحدیث اور صحیح بخاری کی خصوصیات پر اس سے پہلے شائع ہو چکی ہے، اس کتاب پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ ہے، جو موضوع کی اہمیت وافادیت پر حرف آخر ہے، اس میں مولانا کے حدیثی ذوق اور علمی سفر کی قدر افزائی کی گئی ہے، اور مخلصانہ دعاؤں سے نوازا گیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ حضرت والا نے اپنی وفات سے قبل اس کا اجراء بھی فرمایا، اسی کا اثر ہے کہ مولانا نے اپنے علمی وتحقیقی ذوق کی بنا پر ایک دوسری کتاب ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' پر تصنیف کی ہے۔

مصنف کتاب نے اس کتاب میں امام مسلم کی صحیح کو موضوع بنایا ہے، لیکن اس سے پہلے علم حدیث، روایت ودرایت، اقسام حدیث، صحاح ستہ اور ان کے فرق مراتب، تدوین حدیث کے مختلف ادوار کو ذرا تفصیل سے پیش کیا ہے، پھر صحیح مسلم اور اس کی وجہ تالیف، اس کے تراجم، اس کی شروحات، اس کی تلخیصات، اس کی شرائط اور اس کی امتیازی خصوصیات کا

تذکرہ کیا ہے، بنیادی طور پر صحیح بخاری اور صحیح مسلم کتب صحاح میں سرفہرست ہیں، لیکن ان میں یہ فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ صحیح بخاری صحت کے لحاظ سے فائق ہے، اور صحیح مسلم حسن ترتیب کے لحاظ سے فائق ہے، امام مسلم ایک موضوع کی احادیث کو ایک باب میں ترتیب سے جمع کرتے ہیں، مزید اس میں ورع وتقوی اور حزم واحتیاط سے بھی کام لیتے ہیں، اور احادیث بیان کرنے میں اپنی طرف سے کوئی بات بطور تشریح وتوضیح کے داخل نہیں کرتے، امام مسلم نے اس کتاب میں اہتمام کیا ہے کہ اس میں مرفوع حدیثوں کا اہتمام ہو، رواۃ ثقہ ہوں، غرض اس طرح کی بیشمار خصوصیات پر کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اور اخیر میں چند احادیث کی تخریج کر کے اس کو بطور نمونہ قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

میں اس قابل رشک حدیثی عمل پر مصنف کتاب جناب مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام واستاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ان سے علم حدیث کے میدان میں اسی طرح بیش از بیش علمی وتحقیقی کام لیتا رہے، بلاشبہ علم حدیث میں اشتغال رکھنے والوں کے لئے بڑی بشارتیں آئیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو تر وتازہ رہنے کی دعائیں دی ہے۔ ان شاء اللہ یہ صفت بکمال مصنف کتاب کو حاصل ہوگی۔ وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ أنیب، وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ و صحبہ أجمعین.

راقم الحروف

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳/۳/۱۴۴۶ھ

۷/۹/۲۰۲۴ء

تقریظ

امام مسلم کی کتاب ''صحیح مسلم'' دنیا کے خطہ خطہ میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، ہزاروں کتابیں اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں لکھی گئیں، لیکن جو قبولیت امام بخاری کی صحیح بخاری اور امام مسلم کی صحیح مسلم کو حاصل ہوئی، کوئی کتاب اس قبولیت عام میں ان کے برابر نہیں، امام مسلم نے تین لاکھ ان روایات سے اپنی کتاب کے لیے حدیثوں کا انتخاب کیا ہے جو انہوں نے براہ راست اپنے شیوخ سے لی تھیں، پھر انہوں نے صرف اپنی ذاتی رائے پر بس نہیں کیا، بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر وہی حدیثیں نقل کیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا، وہ خود فرماتے ہیں:

"لیس کل شیءٍ عندی صحیح وضعته ههنا إنما وضعت ههنا ما أجمعوا علیه." (صحیح مسلم، باب التشهد فی الصلاة)

(ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا، میں نے تو یہاں صرف ان حدیثوں کو درج کیا ہے جن کی صحت پر مشائخ وقت کا اجماع ہے۔)

امام مسلمؒ نے پندرہ سال کی محنت شاقہ سے یہ کتاب تیار فرمائی، خود بھی ایک ایک حدیث کو جانچا پرکھا اور اپنے وقت کے امام ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کر کے جو کمی رہ گئی تھی وہ بھی دور کردی، وہ خود اپنی تصنیف کے متعلق فرماتے ہیں:

"ما وضعت شیئاً فی هذا المسند إلا بحجة وما أسقطت منها شیئاً إلا بحجة." (اکمال المعلم، ص: ۸۰)

(میں نے اس مسند میں جو بھی شامل کیا ہے وہ دلیل کے ساتھ کیا اور جو نہیں کیا وہ

بھی دلیل کے ساتھ نہیں کیا۔)

صحت روایات میں یہ کتاب دنیا کے کتب خانوں میں دوسرا درجہ رکھتی ہے، اگر چہ بعض علماء نے اس کو نمبر ایک پر رکھا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ صحت میں صحیح بخاری سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں، البتہ موضوعات کے اعتبار سے روایات کے جمع وترتیب میں اس کتاب کا ثانی نہیں، اس طرح یہ کتاب خالص احادیث صحیحہ کا ایسا مرتب مجموعہ بن گئی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب اس امتیاز میں اس کی شریک ہو، صحت حدیث کے ساتھ حسن ترتیب میں بلاشبہ یہ کتاب فرد فرید ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے اس کتاب کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دی ہے، حافظ مسلمہ بن قاسم فرماتے ہیں:

"لم یضع أحد مثله." (المعلم: ۸۰، مقدمة فتح الباری فصل ثانی) (کسی نے ایسی تصنیف نہیں کی۔)

اس میں کیا شبہ ہے کہ صحت کے ساتھ حسن ترتیب میں یہ کتاب لاثانی ہے۔

شاید انہی خصوصیات کی بناء پر حضرت امام موصوف نے صحیح مسلم کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ

"لو أن أهل الحديث يكتبون مائتی سنة الحديث فمدارهم على هذاالمسند الصحيح." (تاريخ الإسلام للذهبی: ۱۸٦/۲۰)

(محدثین اگر دوسو سال تک بھی حدیثیں لکھتے رہیں جب بھی ان کا دارومدار اسی مسند صحیح پر رہے گا۔)

واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے جس اخلاص کے ساتھ یہ عمل انجام دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسو سال کیا ساڑھے گیارہ سو سال گذرنے کو آئے مگر کتاب کی مقبولیت اسی طرح ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل استاذ حدیث خطیب العصر استاذ محترم مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری مدظلہ نے پہلے صحیح بخاری کے سلسلہ میں بہت مفید کتاب تیار فرمائی تھی، اب صحیح مسلم کے بارے میں مولانا نے یہ فاضلانہ کتاب تیار فرمائی ہے، اس میں

صرف صحیح مسلم کے علوم ومضامین، اس کی خصوصیات وامتیازات ہی کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ علوم حدیث پر بھی بہت اہم اور مفید مضامین کتاب میں بطور تمہید کے شامل کر لیے گئے ہیں، صحیح مسلم کے بارے میں اردو میں مستقل کوئی ایسی کتاب جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں ایسی سیر حاصل بحث کی گئی ہو، میرے علم میں نہیں ہے، صحیح بخاری کے علوم ومضامین پر مولانا کی کتاب کو بہت پسند کیا گیا، امید ہے کہ یہ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور خاص وعام اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مولانا کے کاموں میں مزید برکت عطا فرمائے اور ان کو صحت وعافیت کے ساتھ عمر طویل عطا فرمائے۔ آمین!

بلال عبدالحی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۸ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ
۱۲ ستمبر ۲۰۲۴ء

تأثرات

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم أمابعد:

''صحیح مسلم شریف'' نہ صرف مدارس اسلامیہ میں پڑھائی جانے والی حدیث کی مشہور کتاب ہے بلکہ جمہور امت کے نزدیک ''کتاب اللہ'' اور ''صحیح بخاری شریف'' کے بعد دنیا کی اصح ترین کتاب بھی ہے، اسی لئے اس کی تصنیف کے بعد ہی سے ہر دور کے علماء اس کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے ہوئے مختلف پہلوؤں سے اس پر کام کرتے رہے، جس کا مبارک سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی پیش نظر رسالہ ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' بھی ہے، جو فاضل گرامی عزیز القدر جناب مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری زید مجدہم کی تصنیف لطیف ہے، مولانا موصوف دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے مؤقر استاذ حدیث اور مشہور رعالم دین ہیں، آپ کو ایک طرف طویل تدریسی تجربہ بھی حاصل ہے، اور دوسری طرف معاصر افکار ونظریات پر بھی آپ کی اچھی نظر ہے۔

زیر دست رسالہ میں آپ نے مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کے طور پر: حدیث کی تعریف، تقسیم، حجیت، تشریعی مقام، تاریخ تدوین وغیرہ مباحث سے لے کر، طبقاتِ روات، طبقاتِ کتب حدیث، صحاحِ ستہ کا تعارف، نیز امام مسلم کے حالاتِ زندگی، صحیح مسلم کی شرائط، اور استنادی مقام ومرتبہ جیسے اہم موضوعات پر نہایت قیمتی اور مفصل گفتگو کی ہے، اور آخر میں طلبۂ عزیز کے لئے ''صحیح مسلم شریف'' سے دس احادیث کا انتخاب کر کے

ان کی محدثانہ تخریج، مختصر تشریح، اور استنباطِ فوائد وغیرہ کا ایک عمدہ نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اِس خدمت کو شرفِ قبول سے نوازیں، اہلِ علم اور طالبین وشائقین کے لئے مفید ونافع، اور مؤلف زید مجدہم کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین۔

وصلى الله وسلم وبارك على نبينا محمد الأمين، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

محمد عاقل عفا عنہ

۲۷/صفر ۱۴۴۶ھ

تقریظ

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على رسوله سيدنا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين .

علم حدیث ایک رفیع القدر، عظیم الفخر علم ہے کیوں کہ دین وشرع متین کی اصل اساس کتاب اللہ ہے جب کہ آپ ﷺ کی احادیث قولی ہوں یا فعلی، یہ احادیث قرآن کریم میں آئے احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور اس کے اجمال کی تفصیل بیان کرتی ہیں، باری تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ اس کے مقاصد کو واضح کر کے بیان کریں۔

قال اللہ تعالیٰ ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾. (النحل) اس چیز کو سامنے رکھتے ہوئے علماء امت نے دین کی دوسری اصل احادیث رسول ﷺ کو قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ دین کی اصل اول یعنی قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود باری تعالیٰ نے اپنے لئے رکھا ہے، ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ جیسے جیسے آیات وسور کا نزول ہوتا آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام بھی اپنے سینوں میں محفوظ کرتے جاتے، البتہ ظاہری اسباب کے تحت خود سرور کائنات ﷺ لکھواتے، یوں مکمل قرآن کریم آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی بطور کتابت بھی محفوظ ہو گیا تھا۔

کچھ اسباب ووجوہات کی بنا پر آپ ﷺ کی زندگی میں احادیث کو باضابطہ جمع اور مدون نہ کیا جا سکا، علماء امت اس کی مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں، جو اصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

آپ ﷺ کا دور ہے قرآن کریم نازل ہو رہا ہے، آپ ﷺ اور صحابہ کرام بھی اس

کو محفوظ کر لیتے ہیں اور آپ ﷺ اپنے اقوال وافعال کے ذریعہ قرآن کریم کے احکام وغیرہ بیان کرتے ہیں، آپ ﷺ کے یہی اقوال وافعال احادیث کہلاتے ہیں، صحابہ کرام امانت ودیانت داری کے ساتھ اور خداداد یادداشت کے ذریعہ ان اقوال وافعال کو محفوظ کر لیتے ہیں، اس طرح احادیث بھی امانت کے ساتھ محفوظ ہو جاتی ہے۔

لیکن آپ ﷺ اور جلیل القدر اکابر صحابہ کرام کے بعد جب اسلامی ریاست میں وسعت ہوتی گئی تو اکابر تابعین کے دور میں فتنہ وفساد، بدعت وتعصب اور کذب نے جنم لیا، اوران چیزوں نے اسلام کو زبردست نقصان پہنچایا، حتی کہ احادیث نبویہ بھی اس طوفان کی زد سے نہ بچ سکیں، لیکن بفضلہٖ تعالیٰ جلیل القدر تابعین نے اس فتنے کا ایسی جانفشانی سے توڑ کیا کہ احادیث میں وضع وکذب کے ذریعہ نقب لگانے والوں کی اصلیت کھل گئی، ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے اصول حدیث کا فن وجود میں آیا، اور علماء نے باقاعدہ اصول حدیث پر مختلف ادوار میں عظیم اور نافع کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں۔

ان اصول وضوابط کی رو سے احادیث میں صحیح اور غیر صحیح کا وجود ظہور میں آیا، حافظ ابن کثیر کی رائے کے مطابق احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کا اہتمام سب سے پہلے امام بخاری علیہ الرحمہ نے کیا، پھر انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امام بخاری کے ممتاز شاگرد مسلم ابن الحجاج نیشاپوری علیہ الرحمہ نے احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کا فریضہ انجام دیا، لیکن فوقیت اولیت امام بخاری علیہ الرحمہ کی صحیح کو نصیب ہوئی، اور دوسرا درجہ قابل فخر شاگرد امام مسلم کی صحیح کو حاصل ہوا، یہ جمہور علماء امت کی رائے ہے، جب کہ کچھ علماء کرام نے صحیح مسلم کو پہلے درجے میں رکھا ہے ان علماء میں امام حاکم کے استاذ ابوعلی نیشاپوری اور کچھ علماء مغرب بھی شامل ہیں۔

زیر نظر کتاب ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' مع بعض احادیث کی تشریح وتخریج صحیح مسلم کے بارے میں ایک عمدہ، دلچسپ علمی مضامین سے لبریز ہے۔

اس ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' کے مؤلف میرے مشفق ومحسن قابل قدر حضرت مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری دامت برکاتہم ہیں، موصوف محترم کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ تاریخ ساز عالمی شہرت یافتہ ادارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاذ حدیث اور کلیۃ الدعوۃ

والا علام کے عمید محترم ہیں، باری تعالیٰ نے موصوف کو متعدد صلاحیتوں سے بھرپور نوازا ہے، ایک طرف کامیاب استاذ ہیں تو دوسری طرف فن خطابت کی صلاحیت سے بھی مولائے قدیر نے خوب حصہ دیا ہے، نیز فن شاعری کا ذوق بھی حضرت کو اللہ تعالیٰ نے خوب عطا کیا ہے، اس کا اندازہ موصوف کے مجموعہ کلام ''متاع خامۂ دل'' سے ظاہر ہے جو بہت جاذب و دلکش ہے، ان صلاحیتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے موصوف محترم کو قلمی صلاحیت واستعداد بھی عطا کی ہے، بلاشک موصوف اکابر کی نشانی اور قوم کا سرمایہ ہیں۔

زیر نظر کتاب ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' سے قبل حضرت والا نے صحیح بخاری کی خصوصیات پر کتاب بھی تالیف فرمائی، جو الحمد للہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر شرف قبولیت حاصل کرچکی ہے اور اہل علم کے لئے نافع اور سودمند ثابت ہوئی ہے، میری معلومات کے مطابق صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر اردو میں اس طرح کا پہلا کام ہے، ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے شائقین علم حدیث کو ان شاء اللہ بہت فائدہ ہوگا۔

باری تعالیٰ کی ذات سے دعا ہے کہ وہ رب کریم اس کتاب ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' کو بھی شرف قبولیت سے نوازے، اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں اہل ذوق کو صحیح مسلم کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوگا، وہیں احادیث کے بارے میں مفید بحثیں بھی علم میں اضافہ کا سامان فراہم کریں گی، اللہ تعالیٰ باذوق شائقین علم حدیث کو اس سے استفادہ کی توفیق دے، اور موصوف کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے، آمین یارب العالمین۔

طالب دعا

قمر الحسن القاسمی الازہری

استاذ الحدیث وعلومہ: جامعہ رشیدیہ نگینہ، ضلع بجنور (یوپی)

جنرل سکریٹری: جامعہ اصلاح البنات سید پور میراں

(میراپور) ضلع بجنور

۱۵ر صفر المظفر ۱۴۴۶ھ

پیش لفظ

علم حدیث ایک انتہائی اہم، مہتم بالشان جلیل القدر علم ہے، جس کے ذریعہ سیدالاولین والآخرین آقائے نامدار محمد عربی ﷺ کے اقوال، واحوال، آپ کی سنتیں اور سیرت وکردار قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے منتقل ہوا، کسی بھی علم کی قدر ومنزلت، اور اہمیت ومقام کا اندازہ اس کی نسبت سے لگایا جاسکتا ہے، علم حدیث کی نسبت سرور کائنات افضل الخلائق محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہے، پھر یہ کہ علم حدیث وحی ربانی قرآن مجید کی تشریح، منشائے الٰہی کی ترجمانی اور شریعت اسلامی کا دوسرا ماٴخذ ومصدر ہے، مسلمانوں نے جس طرح قرآن کو سینے سے لگایا اور علوم قرآن کی خدمت کو سرمایہ سعادت سمجھا، اسی طرح احادیث نبویہ کو سرآنکھوں پر رکھا اور علوم حدیث کی خدمت اس محنت وعقیدت سے انجام دیں کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، حدیث نبوی ﷺ سے مسلمانوں کا شغف دیکھ کر اس وقت اعداء اسلام نے وضع احادیث کا چور دروازہ نکالا اور من گھڑت روایات پھیلانا شروع کیں تاکہ حق وباطل خلط ملط ہوکر حقیقت ملتبس ہوجائے، مگر حق تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے ایسے رجال کار پیدا کئے جنہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا، صحیح اور غلط کی تمیز کے حیرت انگیز معیار قائم کئے، فن رجال اور جرح وتعدیل کے مراتب قائم کئے، اصول حدیث کا فن وجود میں آیا۔

ایک حدیث نبویؐ میں اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرمایا گیا ہے جس سے حدیث کے مقام، اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے: ''ترکت فیکم أمرین، لن تضلوا ماتمسکتم بهما کتاب اللّٰه و سنة رسوله'' ''میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک ان کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے کبھی گمراہ نہ ہوگے، ایک کتاب اللہ اور دوسری

اس کے رسول ﷺ کی سنت'' قرآن کریم اور حدیث نبویہ ہی دراصل ہدایت کا سرچشمہ اور اساسی مصدر وماٰخذ ہیں، اس کا کوئی امکان نہیں کہ قرآن وحدیث کو ایک دوسرے سے جدا کیا جاسکے، نہ یہ ممکن ہے کہ قرآن کریم پر ایمان ہو اور حدیث نبوی سے انکار، کیونکہ قرآن کریم بار بار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ حضرت رسول ﷺ کی اتباع میں تمہاری نجات ہے اور آپ کی نافرمانی تباہی وبربادی کا موجب ہے، حاصل یہ کہ دنیا وآخرت کی نجات وسعادت اور فلاح وبہبودی آپ کی پیروی میں ہے اور حق تعالیٰ کی محبت واطاعت کا معیار بھی آنحضرت کی متابعت کے سوا کچھ نہیں: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران:۳۱)

جناب رسالت مآب ﷺ کی سنت وحدیث اس طرح اہتمام اور اعتماد کے ساتھ محفوظ ہے کہ اس کے تقدس کی قسم کھائی جاسکتی ہے، حدیث نبوی کا یہ منقول ذخیرہ محدثین کی مخلصانہ کاوشوں بلکہ اسلام کے اعجاز اور اس کی حقانیت وابدیت کی دلیل بھی ہے، اس لئے کہ نہ صرف آنحضرت ﷺ کے احوال واقوال اور ارشادات وفرمودات پورے اہتمام اور استناد کے ساتھ موجود ومحفوظ ہیں، بلکہ ان کے نقل وفہم اور ان سے استدلال واستنباط کے عمل میں کسی بھی درجہ میں شریک ہونے والے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کے حالات وکوائف بھی تاریخ نے اپنے ریکارڈ میں محفوظ کر رکھے ہیں، اور جناب نبی اکرم ﷺ کے کسی بھی فعل، قول اور احوال سے نسبت رکھنے والے کسی بھی شخص کے حالات اور کردار کے بارے میں ضروری معلومات تاریخ کے محفوظ خانہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علم حدیث کے باب میں ایک کام حفاظت حدیث وتدوین حدیث کا تھا، جس کے لئے خدا تعالیٰ نے محیر العقول نابغہ روزگار ہستیوں کو پیدا فرمایا، جہابذہ علم وفن اور علم حدیث کے ماہر محدثین کو پیدا فرمایا، جنہوں نے تدوین حدیث واشاعت حدیث کا غیر معمولی کام کیا ہے، محدثین عظام نے جمع وتدوین کے کام سے امت کو بے نیاز کر دیا ہے، حدیث کے تعلق سے دوسرا کام اور پہلو ہے فہم حدیث واستنباط حدیث، اللہ تعالیٰ نے فہم

حدیث واستنباط حدیث کی صلاحیت رکھنے والے علماء وفقہاء کو ہر دور میں پیدا فرمایا ہے اور قیامت تک خدا کے باتوفیق بندے آتے رہیں گے اور نسل انسانی کے لیے قیامت تک نبوی ہدایات کی تفہیم وتشریح کرتے رہیں گے، احادیث نبویہ سے استفادہ کے لئے حدیث کا صحیح اور متوازن فہم بہت ضروری ہے، ورنہ انسان اپنے نبی کی سنت وسیرت سے استفادہ نہیں کرسکتا، امام ابن الصلاح اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'مقدمہ ابن الصلاح'' میں رقمطراز ہیں: "لا ینبغی لطالب الحدیث أن یقتصر علی سماع الحدیث و کتبه دون معرفته وفهمه، فیکون قد أتعب نفسه من غیر أن یظفر بطائل وبغیر أن یحصل فی عداد أهل الحدیث" علوم حدیث کے طلب گاروں کے لئے نامناسب بات ہے کہ وہ فہم ومعرفت حدیث کے بغیر محض الفاظ حدیث سننے ولکھنے پر توجہ دیں، اس کے فہم ومعرفت کے بغیر حدیث پڑھنے کا مطلب ہے کہ بلاوجہ وہ اپنے کو تھکائیں گے اور بے نیل مرام ہوں گے، ان کا شمار علم حدیث کے منتسبین میں نہیں ہوگا، خطیب بغدادی کا قول ہے 'ولیعلم أن الاکثار من کتب الحدیث وروایته لایصیر بها الرجل فقیهاانما یتفقه باستنباط معانیه وامعان التفکیر فیه" کوئی شخص محض روایت حدیث کی کثرت کے شوق واشتغال سے صحیح معنی میں فقیہ نہیں ہوجاتا ہے بلکہ درحقیقت فہم حدیث، استنباط حدیث اور اس میں گہرے غور وخوض کی صلاحیت ومزاج کے ذریعہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

مدارس اسلامیہ میں کتب صحاح کے علاوہ دیگر مؤلفات حدیث کے پڑھانے کا نظام الحمدللہ جاری ہے، جس سے ہزاروں لاکھوں طلبہ استفادہ کرتے چلے آئے ہیں، کتب صحاح میں "صحیح البخاری"، "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کے بعد جس کتاب کا درجہ اور مقام ہے وہ امام مسلم بن الحجاج القشیری النیسابوری کی "الجامع الصحیح" ہے، جو اپنی صحت مقام درجہ استناد اور پوری امت کے نزدیک تلقی بالقبول کے ساتھ بہت سے امتیازات وخصوصیات کی حامل ہے، اس کتاب کی مقبولیت اور عنداللہ اس کے مقام کی بہترین دلیل یہ بھی ہے کہ پوری امت نے ہر دور میں اس کتاب کو قدر ومنزلت اور احترام کی نظر سے دیکھا اور ہر دور کے علماء

نے اس کتاب کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھا، چنانچہ صحیح مسلم کی شروحات، مستدرکات، مستخرجات، مختصرات تعارف وتراجم رجال، اور مختلف زبانوں میں ترجموں سے متعلق سیکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے، بلکہ قیامت تک جاری رہے گا۔

مقام مسرت ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معروف مؤقر اور سینئر استاد حدیث حضرت مولانا محمد خالد غازیپوری صاحب ندوی مدظلہ "عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام" نے صحیح مسلم کے تعارف سے متعلق ایک بہت جامع وعلمی کتاب مرتب فرمائی ہے جو "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا بجا مصداق ہے، مولانا مدظلہ دارالعلوم میں ایک زمانہ سے حدیث شریف کے استاذ ہیں، اللہ تعالیٰ نے زبان وادب کا بہترین اور قابل رشک ذوق بھی عطا فرمایا ہے اور زبان وبیان کے ساتھ حدیث سے اشتغال کی سعادت بھی بخشی ہے، مولانا مدظلہ نے بڑی جامعیت کے ساتھ "صحیح مسلم" کے متعلقات حدیث وتدوین حدیث کے مباحث اور دیگر ضروری موضوعات پر مفید معلومات جمع فرمادی ہیں، جامعیت کے ساتھ زبان کی چاشنی اور ادبی حلاوت اس پر مستزاد ہے، جس سے کتاب کے علمی مضامین کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے، یقیناً یہ کتاب اہل علم اور طلبہ حدیث کے لئے ایک گرانقدر علمی تحفہ ثابت ہوگی، اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ حضرت مولانا مدظلہ کی اس علمی گرانقدر خدمت کو قبول فرمائے اور مزید علمی وتحقیقی کاموں کے لئے توفیق ارزانی عطا فرمائے، والحمد للّٰہ اولاً وآخراً وصلی اللّٰہ علی النبی الأمی الکریم.

نیاز احمد ندوی

استاذ حدیث وصدر مفتی دارالافتاء والقضاء

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۲ ستمبر ۲۰۲۴ء - ۸ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ

ریویو

بر

''خصوصیات صحیح مسلم''

تالیف: مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

اردو لٹریچر میں دبستانِ شبلی کے ایک نامور فرزند مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء) نے امام مسلم اوران کی صحیح پر مشتمل ایک وقیع تحریر رسالہ ''الندوہ'' (لکھنؤ) دسمبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں سپردِ قلم کیا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اسے ''تذکرۃ المحدثین'' کی جلد اول میں شامل کیا، پھر راقم نے مولانا عبدالسلام کے اس مقالے کو ''تذکرۃ الشیخین'' میں درج کیا، گو مولانا عبدالسلام کا یہ مقالہ مختصر سہی لیکن اپنی افادیت میں بے مثال ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذِ حدیث اور کلیۃ الدعوۃ والاعلام کے عمید باوقار مولانا محمد خالد غازی پوری کی تازہ تصنیف ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' راقم کے زیر مطالعہ ہے۔

مولانا محمد خالد دعوت وخطابت کے میدان میں محتاج تعارف نہیں، وہ عرصۂ دراز سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث شریف کے تجربہ کار اور کامیاب استاذ شمار ہوتے ہیں، ادھر چند سالوں سے موصوف نے تصنیف وتالیف کی طرف رخ کیا ہے اور قلیل مدت میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

زیر ریویو تالیف کا مرکزی موضوع ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' اجاگر کرنا ہے، انہیں اپنی اس کتاب پر کسی کی تقدیم وتقریظ کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ''الکتاب یحدّث نفسہ'' اہل علم کا قدیم خیال ہے لیکن عصر حاضر میں تقریظ نگاری کا رواج بہت عام ہوگیا ہے، راقم محدثین میں امام بخاری اور ادباء میں ابن السکیت (م ۲۴۴ھ) کا پیروکار ہے، ابن خلکان نے ''وفیات الأعیان'' میں ابن السکیت کی کتاب ''اصلاح المنطق'' کو ''کتاب

بلاخطبۃ'' بتایا ہے، اس بحث کو حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' کے آغاز میں اہل علم کے اقوال کی روشنی میں مثالوں سے واضح کیا ہے۔

گو اس کتاب کا مرکزی موضوع ''صحیح مسلم کی خصوصیات'' کو اجاگر کرنا ہے، تاہم اس میں فاضل مؤلف نے حدیث اور علومِ حدیث کے گنجِ گراں مایہ کو کھنگال کر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

مؤلف نے ''گزارشات'' کے زیرِ عنوان موازنہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے، پھر حدیث کی لغوی و اصطلاحی تعریف، علم الحدیث روایۃً و درایۃً، نقدِ حدیث کا معیار، احادیث کی جانچ پڑتال، کتبِ ستہ کے مؤلفین کی شرطیں اور اس کے مراتب و طبقات، تدوینِ حدیث کے آغاز و ارتقاء کے ادوار، حجیتِ حدیث، احادیث کی تصحیح و تضعیف کے اصول و ضوابط .....وغیرہ اہم مباحث کو مؤلف نے سمیٹ کر کوزے میں بند کر دیا ہے۔

یہ مباحث تقریباً سوا سو (۱۲۵) صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، پھر فاضل مؤلف نے عنانِ قلم کا رخ صحیح مسلم، اس کے تراجم، شروحات، مستخرجات، تلخیصات اور صحیح مسلم کے مرتبہ و امتیاز کی طرف کیا ہے۔

بعد ازیں قلم کا مسافر صحیح مسلم کی خصوصیات اجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے اور دس جنگشن (یعنی دس خصوصیات) میں اپنا سفر طے کرتا ہوا ایک مختصر بریک جرنی کرتا ہے اس لیے کہ منزلِ مقصود ہنوز دور است۔

اس وقفے یا جلسۂ استراحت میں قلم کا مسافر امام مسلم کے شرائط اور ان پر اشکالات کو رفع کرتے ہوئے ''حدیث مُعنعن'' میں حضراتِ شیخین جلیلین (بخاری و مسلم) کے درمیان اختلاف کو چھیڑ دیتا ہے اور چلتے چلتے ''الجرح مقدم علی التعدیل'' کے اصول کو بھی چھوتا جاتا ہے۔

پھر قلم کا مسافر تین منٹ (یعنی تین صفحات) میں امام مسلم کا مختصر تعارف کرا کے صحیح مسلم کی دس حدیثوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان احادیث کی تخریج، لطائف اسناد اور فقہ الحدیث کے ذکر کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

ان دس احادیث کی اسنادی بحث اور مستنبط فوائد میں مؤلف کا ماخذ عصر حاضر کے محدث المدینہ علامہ عبدالمحسن بن حمد العباد (سابق وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی اور مدرس حرمِ مدنی) کی مشہور کتاب ''عشرون حدیثاً من صحیح مسلم ودراسة اسانید'' رہا ہے۔

وماتوفيقي الا بالله والصلاة والسلام على رسول الله وعلىٰ آله وصحبه ومن والاه.

کتبہ

تحریر کردہ: ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی

(شعبۂ اختصاص فی علوم الحدیث، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

۳/ستمبر ۲۰۲۴ء

دعائیہ کلمات

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد.

امت مسلمہ کی خصوصیات میں سے ایک عظیم الشان خصوصیت یہ ہے کہ اس امت نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے اقوال وافعال اور احوال کو روز اول سے محفوظ رکھا، ائمہ محدثین میں حضرت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ وہ جلیل القدر حافظ حدیث تھے جن کی کتاب کی صحت پر ساری امت متفق ہے۔

ہمارے مشفق حضرت مولانا محمد خالد ندوی دامت برکاتہم العالیہ نے متقدمین کی اس امانت کی حفاظت کرتے ہوئے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے، جس میں حضرت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی خصوصیات اور فتنہ انکار حدیث کا رد ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت کے علم میں، عمل میں، اور زندگی میں برکتیں عطا فرمائے، آمین اور اس مبارک محنت کو شرف قبولیت بخشے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علماء اور طلبہ کے ساتھ ہر خاص وعام اس مبارک کتاب سے فیض یاب ہوں۔

منجانب

''احقر الحاج'' محمد یونس میمن

مقیم جدہ سعودی عربیہ

۱۵ر صفر المظفر ۱۴۴۶ھ

گزارشات: کچھ کتاب کے بارے میں

امام نوویؒ شرح صحیح مسلم کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن عزیز کے بعد اصح الکتب بخاری شریف اور صحیح مسلم ہیں اگر چہ بعض وجوہ سے بخاری کو صحیح مسلم پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے، حافظ ابن صلاح تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے علوم حدیث میں امام بخاریؒ نے صحیح بخاری تصنیف کی اور اس کے بعد امام مسلمؒ نے صحیح مسلم تالیف فرمائی ہے باوجود یکہ مسلمؒ نے بخاریؒ سے استفادہ کیا ہے، مگر ان دونوں کتابوں کا مقام صحت میں قرآن کریم کے بعد ہے، غرض یہ کہ امام مسلمؒ کی فن حدیث میں بہت سی تصانیف ہیں مگر صحیح مسلم ان کی تصانیف میں اس پایہ کی کتاب ہے کہ بعض مغاربہ نے اس کتاب کے متعلق یہ الفاظ کہہ دیے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد آسمان کے نیچے اس سے زائد اور کوئی صحیح کتاب نہیں۔

حدیث کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے علماء کرام نے چھ کتابوں کو زیادہ مستند و معتبر قرار دے کر صحیح کا خطاب دیا ہے، یعنی ''صحیح بخاری''، ''صحیح مسلم''، ''سنن نسائی''، ''ابوداؤد''، ''ترمذی''، ''ابن ماجہ'' ان کے مراتب بھی اسی ترتیب کے ساتھ ہیں، باقی ان کتابوں میں سب سے زائد مستند صحیح بخاری و مسلم کو قرار دیا ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کون زیادہ معتبر اور کس کا مقام بلند ہے اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے، بعض صحیح بخاری کو فوقیت دیتے ہیں، تو بعض صحیح مسلم کو، مگر حق یہ ہے کہ بعض وجوہ سے صحیح بخاری کو فوقیت اور فضیلت حاصل ہے اور بعض اعتبارات سے صحیح مسلم کا درجہ بلند ہے۔

حافظ عبدالرحمٰن بن علی الربیع یمنی شافعیؒ بیان کرتے ہیں:

تَنازَعَ قَومٌ فِی البُخارِی وَمُسلِمٍ
لَدَیَّ وقالُوا أیُّ ذَینِ تَقَدَّمُ
فَقلتُ لَقد فاقَ البُخارِیُّ صحَّةً
کَماَ فاق فِی حُسنِ الصَّنَاعةِ مسلمٌ

یعنی ایک جماعت نے میرے سامنے بخاری و مسلم میں ترجیح وفضیلت کے بارے میں گفتگو کی، جواباً کہہ دیا کہ صحت میں بخاری اور حسن ترتیب وغیرہ میں مسلم قابل ترجیح ہے۔

ابو عمر بن احمد بن حمدان بیان کرتے ہیں میں نے ابو العباس بن عقدہ سے دریافت کیا کہ بخاری و مسلم میں سے کسے فوقیت حاصل ہے؟ فرمایا وہ بھی محدث یہ بھی محدث، میں نے پھر دوبارہ دریافت کیا تو فرمایا بخاری اکثر اسماء وکنیٰ کے مغالطہ میں آجاتے ہیں مگر مسلم اس مغالطہ سے بری ہیں، غرض یہ کہ مسلم کا سَر دِ اَسانید، متون کا حسن سیاق، تلخیص طرق اور ضبط انتشار صحیح بخاری پر بھی فائق ہے، متون احادیث کو موتیوں کی طرح اس طرح پیش کیا ہے کہ احادیث کے معانی چمکتے چلے جاتے ہیں۔ (منہاج)

شاہ عبدالعزیزؒ تحریر فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم میں خصوصیت کے ساتھ فن حدیث کے عجائبات بیان کئے گئے ہیں اور ان میں بھی اخص خصوص سَر دِ اَسانید اور متون کا حسن سیاق ہے اور روایت میں تو آپ کا ورع تام اور احتیاط اس قدر ہے کہ جس میں کلام کرنے کی گنجائش نہیں، اختصار کے ساتھ طرق اَسانید کی تلخیص اور ضبط انتشار میں یہ کتاب بے نظیر واقع ہوئی ہے، اس لئے حافظ ابو علی نیشا پوری ان کی صحت کو تمام تصانیف علم حدیث پر ترجیح دیا کرتے اور کہا کرتے تھے (مَاتَحتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ كِتَابٌ أَصَحُّ مِن كِتَابِ مُسلِمٍ فِي عِلمِ الحَدِيثِ) یعنی علم حدیث میں روئے زمین پر مسلم سے بڑھ کر صحیح ترین اور کوئی کتاب نہیں ہے، اہل مغرب کی ایک جماعت کا بھی یہی حال ہے کیونکہ مسلم نے اپنی صحیح میں یہ شرط لگائی ہے کہ وہ اپنی صحیح میں صرف وہ احادیث بیان کریں گے جسے کم از کم دو ثقہ تابعین نے دو ثقہ راویوں سے نقل کیا ہو، اور یہی شرط تمام طبقات تابعین اور تبع تابعین میں ملحوظ رکھی ہے، یہاں تک کہ سلسلہ روایت مسلم پر آکر منتہی ہو جائے، دوسرے یہ کہ راویوں کے اوصاف میں صرف عدالت کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ شرائط شہادت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، بخاری کے نزدیک اس قدر پابندی نہیں ہے اور حدیث " انما الأعمال بالنیات" جو صحیح میں موجود ہے اس میں تو یہ شرط نہیں پائی جاتی مگر بنظر ترک اور بخیال صحیح مشہور ہونے کے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (منہاج، بستان المحدثین، مقدمہ تحفۃ الاحوذی)

امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں مسلم نے علم حدیث میں بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جس میں سب سے زیادہ صحیح اور مشہور یہ کتاب ہے اور یہ کتاب بتواتر امام مسلمؒ سے مروی ہے اس لئے اسے مسلم کی کتاب کہنا صحیح اور درست ہے، اور ایک فائدہ خاص جو اس کتاب میں ہے وہ یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے ہر ایک حدیث کو جو اس کے لئے مناسب مقام تھا وہیں ذکر کیا ہے، اور اس کے تمام طریقوں کو اسی مقام پر بیان کر دیا اور اس کے مختلف الفاظ کو ایک ہی مقام پر بیان کر دیا تا کہ ناظرین کو آسانی ہو اور طالب ان چیزوں سے متمتع ہو سکے، اور یہ بات صحیح بخاری میں نہیں۔

امام حافظ عبدالرحمن بن علی شافعی نے چند اشعار مسلم کی تعریف میں کہے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ اے پڑھنے والے، صحیح مسلم علم کا دریا ہے، جس میں پانی بہنے کے راستے نہیں یعنی تمام پانی ایک ہی مقام پر موجود ہے۔

اور ساتھ ساتھ مسلم کی روایتوں کی سلاست بخاری کی روایتوں سے بلند اور فائق ہے، حافظ ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں مسلم کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو، اول سے لے کر آخر تک ایک ثقہ دوسرے ثقہ سے روایت نقل کرتا ہو، اس میں کسی قسم کا شذوذ اور علت نہ ہو، علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ راوی مسلمؒ کے نزدیک ثقہ ہو کیونکہ مسلمؒ نے ۶۱۵ احادیث ایسے حضرات سے روایت کی ہے جن سے بخاری نے روایت نہیں کی ہے، اور ایسے ہی بخاری نے ۴۳۴ احادیث ایسے راویوں سے ذکر کی ہے جن سے مسلم نے روایت نہیں کی ہے، پھر مسلم نے اپنی کتاب میں ایسے طریقہ کو اختیار کیا ہے جس کی بنا پر ان کی کتاب کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے، وہ یہ کہ امام مسلم حدیث کے تمام طرق اور متون کو ایک ہی مقام پر جمع کر دیتے ہیں، باب کے ترجمہ میں اس کے اجزاء نہیں کرتے، حتی الوسع الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں نقل بالمعنی نہیں کرتے۔

چنانچہ راویوں کے الفاظ کو بھی علیحدہ علیحدہ بیان کر دیتے ہیں کہ فلاں نے اخبرنا سے روایت کی اور فلاں نے تحدیث اور انبأنا کی شکل اختیار کی ہے اور فلاں راوی نے عن کے ساتھ حدیث کو بیان کیا ہے، اور حدیث کے ساتھ اقوال صحابہؓ اور تابعین نہیں لاتے، ابن

الصلاحؒ فرماتے ہیں وہ تمام احادیث جن کا امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں صحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا ہے، یقینی طور پر صحیح اور درست ہیں اور جن باتوں کی بنا پر مسلم کی کتاب بخاری کی کتاب سے ممتاز ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمؒ نے اپنی کتاب میں تعلیقات بہت کم ذکر کی ہیں، برخلاف بخاری کے کہ ان کی کتاب میں تعلیقات بکثرت ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: مسلمؒ نے اپنی کتاب میں عمدہ طریقوں کو اختیار کیا اور نہایت احتیاط اور ورع کے ساتھ احادیث کو نقل کیا ہے، جس سے ان کا علو مرتبہ، کمال ورع، علم وتقوی اور جلالتِ شان ظاہر ہے۔

امام مسلمؒ نے احادیث کو تین قسموں پر بیان کیا ہے، ایک تو وہ جسے بڑے اعلیٰ درجہ کے حافظ حدیث نے روایت کیا ہے دوسرے وہ جنہیں متوسط حضرات نے ذکر کیا ہے، تیسرے وہ جسے ضعیف اور متروک لوگوں نے نقل کیا ہے، مسلم نے اپنی کتاب میں صرف پہلی ہی قسم کی احادیث بیان کی ہیں، حاکم اور بیہقی فرماتے ہیں دوسری قسم کی احادیث بیان کرنا چاہتے تھے مگر اس سے قبل ان کی موت آ گئی۔

مسلمؒ کے بعد اور کئی حضرات نے مسلمؒ کی طرح اور کتابیں لکھیں اور عالی سندوں کو حاصل کیا لیکن شیخ ابوعمرو فرماتے ہیں کہ یہ کتابیں اگر چہ صحیح احادیث کے ساتھ مدون کی گئی ہیں مگر پھر بھی صحیح مسلم کا کسی بھی شکل میں موازنہ نہیں کر سکتیں۔ (منہاج)

ان تمام خوبیوں کے بعد مسلمؒ نے شروع کتاب میں علوم حدیث پر ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں وجہ تالیف کے علاوہ فن روایت کے بہت سے فوائد جمع کر دیئے ہیں، اور یہ مقدمہ لکھ کر فن اصول حدیث کی بنیاد قائم کر دی، ابوعلی زاغونی کو ان کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ کس عمل کی بناء پر تمہاری نجات ہوئی، انہوں نے صحیح مسلم کے چند اجزاء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان اجزاء کی بدولت بارگاہ رب العالمین میں نجات حاصل ہوئی۔ (بستان المحدثین)

احادیث صحیح مسلم

احادیث صحیحہ کی ترتیب وتدوین کی بنیاد پر امام بخاریؒ نے اپنی صحیح تصنیف فرما کر

اس کی تکمیل کی، امام مسلمؒ نے نہایت تورع اور احتیاط کے ساتھ اپنی سنی ہوئی تین لاکھ احادیث سے اس کا انتخاب کیا ہے، اثری بیان کرتے ہیں صحیح مسلم میں بعد حذف مکررات چار ہزار احادیث ہیں، شیخ ابن الصلاحؒ بیان کرتے ہیں کہ مسلم ابوزرعہ رازی کے پاس آئے اور کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے، جب وہاں سے اٹھنے لگے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا انہوں نے چار ہزار حدیثیں اپنی تصنیف میں جمع کی ہیں، ابوزرعہ نے فرمایا باقی حدیثیں کس کے لئے چھوڑ دیں، شیخ بیان کرتے ہیں کہ اس شخص کا مقصود یہ تھا کہ علاوہ مکررات کے چار ہزار احادیث ہیں اور مکررات کو ملا کر ۷۲۷۵، احادیث ہیں۔

احمد بن سلمہ بیان کرتے ہیں کہ صحیح مسلم میں بارہ ہزار احادیث موجود ہیں، اور ابو حفص بیان کرتے ہیں کہ آٹھ ہزار حدیثیں ہیں غرض یہ کہ مکررات سمیت اس میں بارہ ہزار احادیث ہیں، امام نوویؒ فرماتے ہیں امام مسلمؒ نے طوالت کی وجہ سے ابواب کو صحیح مسلم میں داخل نہیں فرمایا ہے۔ (فتح الملہم۔ منہاج شرح صحیح مسلم)

یہ ہے خلاصہ اس کتاب کا جو آپ کے سامنے ہے، اس کے علاوہ تدوین حدیث عہد بہ عہد کے ساتھ ساتھ حجیت حدیث پر بھی سیر حاصل بحث کو شامل کتاب کیا گیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت و نافعیت بڑھ گئی ہے، اس طرح کتاب کا آخری باب تخاریج حدیث پر مشتمل ہے، جس میں دس حدیثوں کا انتخاب کر کے ان کی تخریج کی گئی ہے، تاکہ فن حدیث سے اشتغال رکھنے والے اس فن سے استفادہ کر سکیں، یہ ساری کوششیں اللہ کے فضل سے اس کی رضا کے حصول کے جذبہ سے کی گئی ہیں، اگر کوئی خامی نظر آئے تو یقیناً وہ ہماری کم مائیگی کا نتیجہ ہے، اہل علم کے مشورہ سے آئندہ اس پر نظر ثانی کے ساتھ تصحیح کر دی جائے گی، امید کہ اہل علم کے حلقہ میں یہ کتاب بار پا سکے گی اور استفادہ کیا جائے گا، خصوصاً وہ طلباء جو صحیح مسلم پڑھ رہے ہیں ان کے سامنے اس کے امتیازات اور خصوصیات پر مبنی تحریریں بے حد مفید اور مؤثر ثابت ہوں گی، اسی کے ساتھ ساتھ اپنے کرم فرما حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جنہوں نے اپنی پیرانہ سالی اور طویل علالت کے باوجود اس کتاب

پر اپنے مفید مقدمہ سے زینت بخشی ہے، ہم حضرت کے بے حد ممنون ہیں، اور ندوۃ العلماء کے ناظم جناب مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب حفظہ اللہ کے بھی بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے کثرت کار اور عدیم الفرصتی کے باوجود تقریظ سے نوازا، اسی طرح اپنے کرم فرما جناب الحاج یونس میمن صاحب کے تأثرات اور شیخ الحدیث جناب مولانا قمر الحسن صاحب قاسمی ازہری، اور جناب مولانا نیاز احمد ندوی استاذ حدیث وصدر مفتی دارالافتاوالقضاء ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے فاضلانہ مقدمہ سے اپنے احساسات کی ترجمانی کی ہے، اور حضرت مولانا عاقل صاحب مظاہری شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور کے تأثراتی کلمات نے معنوی اور روحانی بالیدگی عطا کی ہے، اور مولانا ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی استاذ ندوۃ العلماء کا بھی مشکور وممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کی اہمیت اور باریکی بہت سلیقے سے بیان کی، اسی طرح حضرت مولانا امجد قاسمی صاحب حفظہ اللہ (شکاگو امریکہ) کا ممنون ہوں کہ موصوف کے حسن تعاون سے طباعت کا مرحلہ آسان ہوا، اللہ تعالیٰ ان تمام محسنین کو جزائے خیر دے، اخیر میں عزیز القدر مولوی ابوبکر صدیق ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مولوی محمد کلام الدین ندوی کا شکر گزار ہوں کہ ان دونوں نے کتاب کو طباعت کے مرحلہ تک پہنچانے میں ہمارا بھرپور تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور اس کتاب کی افادیت کو عام اور تام فرمائے، آمین۔

فقط خادم

محمد خالد ندوی غازی پوری

استاد حدیث کلیۃ الشریعہ واصول الدین

وعمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۴ ستمبر ۲۰۲۴ء

۱۰ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ

علمِ حدیث

حدیث وہ پاکیزہ علم ہے جس کا براہِ راست تعلق نبی آخرالزماں سید الاوّلین والآخرین کی زندگی کے مختلف گوشوں اور آپ کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے معجز بیان ان شہ پاروں سے ہے جس کی نظیر عربی ادب کی تاریخ میں اس وافر مقدار اور مستند حوالوں سے نہیں ملتی، اور ظاہر ہے کہ جس ذات پر قرآن کریم جیسی معجزانہ اور علوم وفنون کا گنجینہ جیسی کتاب نازل کی گئی ہو خود اس کی گفتگو اعجازی شان سے خالی ہو، وہ خود علوم کا سرچشمہ نہ ہونا ممکن ہے۔

حدیث کے لغوی اور اصطلاحی معنی:

لغت عربی کے امام علامہ جوہری نے صحاح میں حدیث کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں" الحدیث: الکلام، قلیله و کثیره، و جمعه أحادیث" یہ لغوی معنی ہے، جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ہر قسم کے کلام کو حدیث کہہ سکتے ہیں، لیکن جب اصلاً حدیث بولتے ہیں تو اس کا عام طور پر اطلاق اس لغوی مفہوم پر نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا اطلاق عموماً اس مفہوم پر ہوتا ہے جو حدیث کے اصطلاحی معنی کو متضمن ہے یعنی حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال اور تقریرات وحلیے کے مجموعہ کا نام حدیث ہے۔

لغوی واصطلاحی معنی میں ربط:

اس مفہوم کو ذرا اور وسعت کے ساتھ بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور اس میں لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں باہم مناسبت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، لہٰذا حدیث کی تعریف یوں بھی

کر سکتے ہیں قرآن کریم دین الٰہی کی آخری اور مکمل کتاب ہے جو حضرت خاتم النبین ﷺ پر نازل کی گئی اور آپ کو اس کا مبلغ و معلم بنا کر دنیا میں مبعوث کیا گیا، چنانچہ آپ نے اس کتاب مقدس کو اول سے آخر تک لوگوں کو سنایا، لکھوایا، یاد کرایا، اور بخوبی سمجھایا، اور خود اس کے جملہ احکام و تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر امت کو دکھایا، آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ حقیقت میں قرآن مجید کی قولی و عملی تفسیر ہے، اور آپ کے ان ہی اقوال و اعمال اور احوال کا نام حدیث ہے۔

مذکورہ مجموعہ پر حدیث کا اطلاق حقیقت میں کوئی خودساختہ اصطلاح نہیں بلکہ قرآن پاک و حدیث سے اس کی تائید و توثیق ہوتی ہے، بلکہ اس سے یہ مفہوم مستنبط ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں دین کو نعمت قرار دیا گیا ہے اور اس نعمت کی ترویج و اشاعت کو تحدیث سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے؛

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَ مَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ﴾ (البقرة ٢٩٤)

''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور جو تم پر کتاب و حکمت کو نازل فرمایا کہ تم کو اس کے ذریعہ نصیحت فرمائے''، اور تکمیل دین کے سلسلہ میں فرمایا گیا؛

﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدة ١٤)

''آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔''

ملاحظہ فرمایئے ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم نے دین کو نعمت کہا ہے اور سورہ والضحیٰ میں آنحضرت ﷺ کو اس نعمت کے بیان کرنے کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے ﴿وَ أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ اور اپنے رب کی نعمت بیان کیجیے، بس آنحضرت ﷺ کی اس تحدیث نعمت کو حدیث کہتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ نے حدیث کو قدیم کی ضد قرار دیا ہے، اس طرح کلام رسول کو کلام

ربانی سے متمایز کرنے کی کوشش کی ہے، حافظ سخاویؒ نے فتح المغیث میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن وجہ تسمیہ سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے جس کو پہلے ذکر کیا گیا ہے، ہر چند کہ بعض حضرات اس توجیہ پر بھی نکتہ بعد الوقوع کا الزام عائد کرتے ہیں لیکن قرآن پاک پر غور کرنے سے اس الزام کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی کیونکہ متعدد مقامات پر انبیاء علیہم السلام کے اقوال واعمال واحوال کے لئے حدیث ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورۃ الذاریات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ اس طرح شروع ہوتا ہے ﴿هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾ (الذاریات (۴۲) کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی بات آپ تک پہنچی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو مقامات پر یوں آیا ہے ﴿هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى﴾ (طٰہٰ۱۴/ النازعات (۴۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات آپ کو معلوم ہوئی، خود آنحضرت ﷺ کے قول مبارک کے لئے بھی قرآن مجید میں حدیث کا لفظ موجود ہے ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا﴾ (التحریم ۱۴) اور جب نبی ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے رازدارانہ گفتگو کی۔

اسی طرح حدیث کا ماخذ خود کلام رسول اللہ ﷺ بھی ہے جس میں خود آپ نے اپنے اقوال وافعال کے لئے حدیث کا لفظ استعمال فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے: "حَدِّثُوْا عَنِّيْ وَ لَا حَرَجَ" اسی طرح "مَنْ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِيْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا" یہ حدیث سنداً ضعیف ہے لیکن حافظ سخاویؒ نے المقاصد الحسنہ میں اس کی تحقیق کی ہے چنانچہ متعدد طرق کی بنیاد پر یہ حدیث 'حسن لغیرہٖ' کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، اس کے علاوہ اور بھی اس کے نظائر ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال اور احوال کے لئے لفظ حدیث کا استعمال زمانہ مابعد کی اصطلاح نہیں ہے۔

حدیث کے مترادفات:

حدیث کے مفہوم میں چند اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں، یعنی روایت، اثر، خبر اور

سنت، صحیح یہ ہے کہ علماء حدیث کے نزدیک یہ سب الفاظ مرادف ہیں، بعض حضرات نے معمولی فرق بھی کیا ہے، روایت کا اطلاق تو بالاتفاق حدیث کے لغوی مفہوم پر ہوتا ہے البتہ حدیث، خبر، سنت اور اثر کے مابین کچھ معنوی تفریق کا پتہ چلتا ہے، "إِنَّ الْحَدِيْثَ اِسْمٌ لِلْمَرْفُوْعِ ، وَ الْاَثَرُ اِسْمٌ لِلْمَوْقُوْفِ عَلَى الصَّحابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ" مرفوع روایت حدیث ہے اور صحابہ وتابعین پر موقوف روایت کو اثر کہا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں فقہائے خراسان کی تعریف کو قبول کیا ہے جبکہ امام نووی نے شرح مسلم (ج ا ص ۳۶) میں لکھا ہے کہ جمہور خلف وسلف کے نزدیک حدیث واثر میں کوئی فرق نہیں ہے، علامہ عبدالحی فرنگی محلی نے ظفر الامانی (ص ۴۱۵) میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

اسی طرح سنت کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے صرف عمل کا نام ہے، حالانکہ امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام نسائیؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ، دار قطنیؒ، اور دارمیؒ نے اپنی کتاب کو السنن کے نام سے یاد کیا ہے، حالانکہ ان میں موقوف احادیث بکثرت موجود ہیں، اسی طرح حدیث کی مشہور کتاب "منتقى الأخبار في كلام سيد الأبرار" میں لفظ خبر کو حدیث کا مرادف قرار دیا ہے، لہٰذا محدثین کا یہ طرز عمل بتلاتا ہے کہ حق بات یہ ہے کہ عام استعمال میں یہ تمام الفاظ مرادف ہیں اور ان کو ایک دوسرے کی جگہ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے، اس موضوع کے لئے "انهاء السكن" مؤلفہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

علم حدیث:

حدیث کی صحیح معرفت کے لئے علم حدیث سے اشتغال ضروری ہے، بغیر اس علم کے حدیث کا نہ صحیح مقام متعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی صحیح احکام کی معرفت ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے اس طرف بڑی توجہ صرف کی اور اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات اس علم کی مشاطگی میں لگا دیئے ہیں اور اس کے متعلقات پر ایسی تفصیلات درج فرمائی ہیں کہ اس

فن کو بھی علوم قرآن جیسی وسعت حاصل ہوگئی ہے چنانچہ علوم حدیث کی تعداد کی بابت علامہ ابن مُلَقِّن سے منقول ہے کہ وہ دوسو سے زائد ہیں ان مشہور محققین میں حاکم نے پچاس امام نووی نے ۶۵ رعلامہ سیوطی نے ۹۳ رذکر کیے ہیں، اور ابن حبان اور ابو حاتم نے صرف حدیث ضعیف کے تحت ۴۹ رعلوم کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ مناوی نے ۲۹۱ راقسام کو عقلاً ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس اختلاف کی اصل بنیاد تحریر وتقریر میں اختصار ہے کہ بعض حضرات نے بہت سی احادیث کو ضمناً لیا ہے، اور بعض نے مستقل علوم وفنون کی حیثیت سے شمار کیا ہے، لیکن اصولی طور پر یہ دیکھا جائے تو اس فن کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں، چنانچہ علامہ ابن الاکفانیؒ نے ارشاد القاصد میں لکھا ہے کہ علم حدیث کی ابتداءً دو قسمیں ہیں:

(۱) علم روایت الحدیث (۲) علم درایت الحدیث۔

علم حدیث کی تعریف:

علامہ بدرالدین عینی نے ان دو قسموں کی توضیح وتحقیق سے قبل علم حدیث کی تعریف ان الفاظ میں عمدۃ القاری کے اندر کی ہے "عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ أَقْوَالُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَأَفْعَالُهُ وَأَحْوَالُهُ" اور حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں اس کو یوں بیان کیا ہے "مَعْرِفَةُ مَا أُضِيفَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَوْلًا لَهُ أَوْ فِعْلًا أَوْ تَقْرِيرًا أَوْ صِفَةً" حضور اکرم ﷺ کی طرف قول فعل تائید اور وصف کی نسبت کی معرفت کو علم حدیث کہا جاتا ہے، چنانچہ احادیث موقوفہ اور مقطوعہ اس تعریف سے خارج ہو جاتی ہیں اس لئے حافظ عراقی نے "فتح الباقي بشرح ألفية العراقي" میں احاطہ تعریف میں اسے بھی لانے کے لئے "أو إلى أصحابه أو إلى من دونه" کا اضافہ کیا ہے، اس تقیید سے آثار موقوفہ اور مقطوعہ دونوں علم حدیث کی تعریف میں شامل ہو جاتے ہیں بلکہ اس تعریف کی رو سے علم حدیث کے ساتھ علم تاریخ کی بھی شمولیت ہو جاتی ہے اور شاید حافظ عراقی کا مقصود بھی یہی رہا ہو، اور ممکن ہے کہ "كشاف اصطلاحات الفنون" میں "جملة الأخبار المرويات" کو "الحديث" کہنا حافظ عراقی کی تعریف کی صدائے بازگشت ہو۔

روایت ودرایت کی تعریف:

علم حدیث روایۃً کا مصداق وہ حدیث ہے جس کو سن کر حسب موقع محفوظ کر کے نقل کرنا خواہ وہ حضورﷺ سے مروی ہو یا اصحابؓ اور تابعینؒ سے، ان مرویات کا تعلق قول و فعل سے ہو یا تائید وتقریر سے یا جسمانی احوال سے خواہ ان کی نقل وحکایت یادداشت کی مدد سے ہو یا بذریعہ تحریر وکتابت، لہٰذا کسی حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ فلاں کتاب میں ہے فلاں سند اور فلاں الفاظ کے ساتھ مروی ہے یہ علم روایۃ الحدیث ہے۔

اور اسی حدیث کے بارے میں تحقیق کے ساتھ یہ معلوم ہونا کہ وہ خبر واحد ہے یا مشہور، صحیح ہے یا ضعیف، متصل ہے یا منقطع اس کے رجال ثقہ ہیں یا غیر ثقہ نیز اس حدیث سے کیا کیا احکام مستنبط ہوتے ہیں اور کوئی تعارض تو نہیں، اگر ہے تو کیونکر رفع کیا جا سکتا ہے، یہ سب باتیں علم درایۃ الحدیث سے متعلق ہیں۔

تنبیہ: یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اس کے مجموعہ کو مختلف عنوانوں سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً (۱) علم درایۃ الحدیث (۲) علوم الحدیث (۳) علم الحدیث (۴) علم اصول الحدیث (۵) علم مصطلح الحدیث۔

ان میں آخر کے دو علم یعنی علم اصول الحدیث یا علم مصطلح الحدیث کی تعبیر پہلی تینوں قسموں پر علی الاطلاق استعمال کرنا بہتر نہیں ہے۔

اس لئے کہ ان کا ظاہری مفہوم وموضوع محض وہ اصول وقواعد ہیں جن سے احادیث پر عمل کے حق میں مدد لی جاتی ہے اور یہی دونوں تعبیرات ان اصول وقواعد کے علم کے لئے معروف ہیں، لیکن بعض حضرات نے علم درایۃ الحدیث اور علم اصول الحدیث کو مرادف قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ عثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں اور شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے 'اوجز' کے مقدمہ میں اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے، لیکن یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ علم درایت حدیث کی تعریف میں استخراج معانی بھی آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت کے احکام کا استنباط بھی علم

درایۃ الحدیث کا جز ہے، حالانکہ علم اصول حدیث میں استخراج معانی سے کوئی بحث نہیں کی جاتی، اس تجزیہ سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ اصلاً علم درایۃ الحدیث کی بھی دو شاخیں ہیں۔

(۱) علم اصول الحدیث: جس میں روایت کی اسنادی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے۔

(۲) علم فقہ الحدیث: جس میں کسی حدیث سے احکام و مسائل مستنبط کیے جاتے ہیں۔

حدیث کی کسوٹی:

حدیث کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے حقیقتاً یہی دو علوم فن روایت اور فن درایت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، فن روایت کے متعدد اقسام ہیں، اصول حدیث، جرح و تعدیل، اسماء الرجال و علل، وغیرہ، اور عام طور پر حدیث کی صحت و ضعف کو پہنچاننے کے لئے محدثین ان ہی فنون سے کام لیتے ہیں، جب کہ درایت حدیث سے عام طور پر فقہی مسائل کے استخراج و استنباط میں کام لیا گیا ہے، چنانچہ جس قدر اصول روایت پر محدثین نے توجہ دی ہے شاید فن درایت کو اس کا صحیح مقام اسی تناسب سے نہیں مل سکا ہے، جس کا بہت سے اہل علم کو اعتراف بھی ہے چنانچہ ایک مشہور مدرسہ کے شیخ الحدیث نے ایک موقعہ پر جب مولانا تقی امینی صاحب مرحوم صدر شعبہ دینیات علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے اس سلسلہ میں سوال کیا کہ حدیث کا روایتی معیار تو ہم لوگوں کے سامنے ہے اور مدارس میں اس پر کافی گفتگو بھی ہوتی ہے لیکن حدیث کا درایتی معیار کیا ہے، جس کی اس دور میں خاص طور سے ضرورت بیان کی جاتی ہے اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا امینی یوں رقم طراز ہیں رسول اکرم ﷺ کی طرف دین و شریعت سے متعلق جو کچھ منسوب ہو اس کو حدیث کہتے ہیں، اس نسبت کی صحت کو جانچنے کے لئے اہل علم نے ایک معیار مقرر کیا ہے جس کا نام درایتی معیار ہے، لغت میں درایت کے معنی معرفت کے ہیں، حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ راوی (حدیث نقل کرنے والا) اور مروی (حدیث) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں، یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا اور اس کا حافظہ قوی تھا یا کمزور، نظر

سطحی تھی یا گہری، فقیہ تھا یا غیر فقیہ، جاہل تھا یا عالم، اخلاق و کردار کیسے تھے ذریعہ معاش اور مشاغل کیا تھے؟ روایت کرنے میں مقررہ شرطوں کا لحاظ کیا ہے یا نہیں؟

اسی طرح مروی حدیث کے بارے میں معلوم ہو کہ الفاظ و جملوں میں کسی قسم کی خامی و کمزوری یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے، نیز معانی و مفہوم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ زمانے کے طبعی تقاضے، مسلمہ اصول، اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے، جن سے کسی طرح بھی شان نبوت پر حرف آئے یا فرمودات نبوی میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو، حدیث کے تنقیدی مطالعہ میں سر دست اسی کو اہمیت دی جارہی ہے (مراسلات ج ۱/۲۳۔۲۵)

نقد حدیث:

حدیث کی تنقید کوئی آسان کام نہیں اور خصوصاً درایت حدیث کا باب تو بہت ہی عظیم ہے، بہت مغلق ہے ہر کس و ناکس کی بات نہیں کہ زبان دراز کرے اور جو عقل میں آئے اس کو چسپاں کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس کے لئے علم، تجربہ، عربیت اور دیگر علوم کی ضرورت ہوگی، مثلاً عربی زبان سے متعلق تمام ضروری علوم اصول فقہ اور بقدر ضرورت علوم قرآن بھی جیسے علم تفسیر سے واقفیت کے لئے اس انداز کی جامعیت ضروری ہے، البتہ روایت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اسانید کی جانچ:

سنت کے علوم روایت اور اس کے اصول و مآخذ سے متعلق علماء نے مفصل کتابیں لکھی ہیں اس لئے کہ یہ ایک عظیم الشان علم ہے جس کا جاننا نہایت ضروری ہے کیونکہ حجت ہونے کے لئے حدیث متصل الاسناد ہونا عام حالات میں اکثر ائمہ کے نزدیک ضروری ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ صحابہ کے دور ہی میں راویوں کی توثیق و تضعیف کے بارے میں بحث و کلام کی ابتداء ہوگئی تھی چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت انس

ابن مالکؒ اور حضرت عبادۃ بن الصامتؓ کے دور میں اس پر خصوصی توجہ دی گئی، تفصیلات کے لئے صحیح مسلم کا مقدمہ دیکھا جا سکتا ہے، تابعین میں سے سعید ابن المسیبؒ، شعبی، ابن سیرینؒ اور اعمشؒ بھی اسی روش پر کاربند رہے بعد میں حضرت شعبہؒ کا طریق بھی ایسا ہی تھا اور امام مالکؒ کی احتیاط اس بارے میں مسلم ومعروف ہے، تیسری صدی ہجری میں اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں، اور مستقل جرح وتعدیل کا فن وجود میں آیا۔

فن درایت:

فن روایت کی طرح فن درایت کی ابتداء بھی دور صحابہ کی مرہون منت ہے، دور صحابہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو باقی رہتا ہے یا نہیں؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان بیان کیا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ پھر تو گرم پانی سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ یہ روایت ان کے نزدیک خلاف عقل تھی اس لئے انہوں نے قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ خیال کیا کہ سننے یا سمجھنے میں تسامح ہو گیا ہوگا۔

ایسے ہی حضرت عبداللہ ابن عمروؓ غسل جنابت وغیرہ میں عورتوں کو چوٹی کھولنے کا حکم دیتے تھے، جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو معلوم ہوا تو فرمانے لگیں "یَا عَجَباً لِابْنِ عَمْرٍو هٰذَا، يَأْمُرُ النِّسَاءَ إِذَا اغْتَسَلْنَ أَنْ يَنْقُضْنَ رُؤُوسَهُنَّ، أَفَلَا يَأْمُرُهُنَّ أَنْ يَحْلِقْنَ رُؤُوسَهُنَّ" (مسلم ج ۱ رحکم ضفائر المغتسلۃ) ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ ابن عمروؓ کے اس نقطہ نظر کی تردید کی ہے چونکہ مرد کے لئے اس سلسلہ میں سر کے سارے بالوں کا تر کرنا ضروری ہے اگر ضفائر ہوں تو کھولنا ضروری ہے لہٰذا کیا وجہ ہے عورتیں اس حکم میں شامل نہ ہوں، حضرت عائشہؓ صرف اس کے خلاف روایت ہی نہیں سناتیں کہ "لَقَدْ كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ وَ لَا أَزِيدُ عَلَىٰ أَنْ أُفْرِغَ عَلَىٰ رَأْسِي

ثَلَاثَ إِفْرَاغَاتٍ "(مسلم) بلکہ درایۃً بھی انہوں نے اس نظریہ کی تردید کی کہ عورتوں کو اس غایت احتیاط میں سر گھٹانے کا حکم کیوں نہیں دیتے، جب کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اسی بنیاد پر علی الالتزام حلق پر عامل تھے، حضرت عائشہؓ نے عورتوں کے حق میں اس کو خلاف عقل بتایا اور یہ بات حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے نزدیک بھی محقق تھی، لہٰذا اسی کے ذریعہ اولاً ان کے نظریہ کی تردید فرمادی، اس کو درایت کہتے ہیں۔

اس باعث جب تدوین حدیث کا دور شروع ہوا تو ائمہ محققین نے جہاں روایت کے اصول وضع کئے وہاں با قاعدہ درایت کے اصول بھی وضع کئے چنانچہ علامہ ابن جوزیؒ نے اس موقع پر لکھا ہے جس حدیث کو دیکھو کہ وہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ موضوع ہے، اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ احادیث بھی قابل اعتبار نہیں جو محسوسات و مشاہدات کے خلاف ہوں، اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہوں، یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی یا معمولی کام پر بڑے اجر کا وعدہ ہو، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جاتی ہو، مثلاً یہ حدیث کہ کدو ذبح کئے بغیر نہ کھاؤ، اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو اس کے راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے، یہ تمام قرینے خود درایت کے متعلق ہیں، کبھی قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، جب کہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جو کسی اور نے بیان نہ کی ہو اور خود راوی اس سے ملا تک نہ ہو یا ایسی حدیث ہو جس کو صرف ایک راوی بیان کرتا ہو، حالانکہ وہ معاملہ ایسا ہو کہ اس سے اوروں کو بھی واقفیت ہونی چاہئے تھی، ان سب چیزوں کی تصریح خطیب بغدادی نے الکفایۃ کے ابتداء میں کی ہے۔

علامہ ابن جوزیؒ کی یہ بات کہ جو روایت عقل کے خلاف ہو وہ موضوع ہے صحیح نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ اس صورت میں ہر شخص کسی نہ کسی روایت کو خلاف عقل ثابت کرنے کی کوشش کرے گا اور مطابق عقل اور خلاف عقل کی تعیین بہت مشکل ہو جائے گی، اس لئے کہ عقل کی کوئی حد معین نہیں ہے لیکن اس امر کا قطعی فیصلہ کرنا بہر حال مشکل ہے

کیونکہ عام تصور یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ ہوں اور سلسلہ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو اس روایت کو ہر صورت میں قبول کیا جائے خواہ وہ درایت وعقل کے خلاف کیوں نہ ہو۔

چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت النبی میں اس موضوع پر کلام کیا ہے، بلکہ دیگر تصنیفات میں بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، ان کے بھی کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک احادیث کو پرکھنے کا ایک اصول درایت بھی ہے جس طرح قرآن کریم کے خلاف کوئی روایت ہو رد کردی جائے گی اور یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کی سند کیسی ہے؟ اسی طرح جو روایت عقل کے خلاف ہو وہ بھی رد کردی جائے گی سند دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

آخری جملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالرؤف داناپوری نے اصح السیر میں لکھا ہے کہ عقل کو معیار بنانے کا اگر یہ مطلب ہے کہ جو عقل وسمجھ سے باہر ہو اس کا انکار کر دیا جائے تو بڑی مشکل ہے، معاد کی باتیں اگر ایسی ہیں جن کا ادراک عقل نہیں کرسکتی، حشر نشر، عذاب قبر، اعمال اعتقادیات کی اکثر باتیں ہیں جن میں عقل کو دخل نہیں ہے، یہ سب باتیں انبیاء کرام کی تعلیم سے معلوم ہوتی ہیں، کیا ان چیزوں کا اس لئے انکار کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتیں۔

لیکن مولانا داناپوری کی عبارت بالاغور سے پڑھی جائے تو خود معلوم ہوتا ہے کہ موصوف خود بھی اس بات کے قائل ہیں کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن میں عقل کو دخل ہے، حالانکہ انہوں نے اکثر باتوں میں عقل کے دخیل ہونے کا انکار کیا ہے لہذا ہم سمجھنے پر مجبور ہیں کہ کچھ صورتیں ایسی بھی ہیں جہاں عقل بداہتہً فیصلہ کرنے کے حق میں ہوتی ہے اور اس کا خود موصوف کو بھی اعتراف ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ 'بلاشبہ بعض حدیثیں ایسی بھی ہیں جن سے اجتماع ضدین کا مثلاً جواز ثابت ہوتا ہے اور وہ عقل ہی کے نہیں بلکہ عقل صریح اور بداہت کے خلاف ہے، اس تصریح سے بہرکیف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جنہوں نے عقل کی حاکمیت کو روایت کی تحقیق میں تسلیم کیا ہے وہ بات بھی صحیح ہوسکتی ہے۔

ملاعلی قاریؒ موضوعات کبیر میں لکھتے ہیں:

"وَقَدْ سُئِلَ اِبْنُ الْقَيِّمِ الْجَوْزِيَّةُ هَلْ يُمْكِنُ مَعْرِفَةُ الْحَدِيْثِ الْمَوْضُوْعِ بِضَابِطٍ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُّنْظَرَ فِيْ سَنَدٍ فَقَالَ هٰذَا سُؤَالٌ عَظِيْمُ الْقَدْرِ، وَإِنَّمَا يَعْرِفُ ذٰلِكَ مَنْ تَطَلَّعَ فِيْ مَعْرِفَةِ السُّنَنِ الصَّحِيْحَةِ وَخَلَطَتْ بِلَحْمِهٖ وَدَمِهٖ وَصَارَ لَهٗ فِيْهَا مَلَكَةٌ وَاخْتِصَاصٌ شَدِيْدٌ بِمَعْرِفَةِ السُّنَنِ وَالْآثَارِ وَمَعْرِفَةِ سِيْرَةِ الرَّسُوْلِ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَهَدْيِهٖ فِيْمَا يَأْمُرُ وَيَنْهٰى عَنْهُ وَيُخْبِرُ عَنْهُ وَيَدْعُوْ إِلَيْهِ وَيُحِبُّهٗ وَيَكْرَهُهٗ وَيَشْرَعُهٗ لِلْأُمَّةِ."

علامہ ابن قیم جوزیؒ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حدیث موضوع کو کسی قاعدہ سے جان لیں بغیر سند دیکھے ہوئے کہا کہ یہ بڑے مرتبہ کا سوال ہے، یہ وہ شخص جانتا ہے جو سنن پر حاوی ہو اور جس کے خون اور گوشت میں وہ مخلوط ہوگئی ہو، اور اس میں اس کو سنن و آثار اور طریقہ رسولؐ پہنچاننے کا ملکہ حاصل ہو گیا ہو، اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ حضرات کچھ اہم تقیدات کے ساتھ ہی عقل کے خلاف ایسی روایات کو لغو و باطل قرار دیتے ہیں جو خواہ سنداً صحیح ہی کیوں نہ ہوں، مثلاً، "تلك الغرانيق العلى وإن شفاعتهن لترتجى" والی روایت جس میں یہ بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ سورہ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے اور شیطان نے اثنائے تلاوت میں آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات ادا کرادیے یا یہ الفاظ نکلوادیے یا آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ کلمات خود شیطان نے کہے جن سے بتوں کی واضح تعریف اور مشرکانہ ذہنیت کے مطابق ان کے مقام و مرتبہ کی مکمل تائید ہوتی ہے، لیکن عقلاً یہ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ اللہ رب العزت نے جس مقام پر آپ کو فائز کیا تھا اگر اس روایت کو تسلیم کیا جائے تو دین و شریعت کی ساری بنیاد متزلزل نظر آتی ہے اسی لئے متعدد محدثین نے اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اور اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر ایسا واقعہ پیش آیا ہوتا تو بہت سے لوگ اسلام چھوڑ بیٹھتے یا پھر داخل اسلام ہونے کا عقلی و شرعی کوئی محرک نہیں ہوتا، حضرت امام نوویؒ نے باب سجود التلاوۃ کی مندرجہ ذیل حدیث:

"إِنَّهُ قَرَأَ النَّجْمَ فَسَجَدَ فِيهَا وَسَجَدَ مَنْ كَانَ مَعَهُ غَيْرَ أَنَّ شَيْخاً أَخَذَ كَفًّا مِنْ حَصىً أَوْ تُرَابٍ فَرَفَعَهُ إِلَىٰ جَبْهَتِهِ وَقَالَ يَكْفِينِي هٰذَا قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُهُ بَعْدُ قُتِلَ كَافِرًا." (مسلم ج ۳/ص ۵/۷، باب سجود التلاوۃ)

آپ نے سورہ نجم کی تلاوت کی تو سجدہ کیا اور حاضرین نے بھی سجدہ کیا البتہ ایک معمر شخص نے ہاتھ میں کنکری یا مٹی لے کر پیشانی سے لگالیا اور کہا کہ یہ کافی ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں اس شخص کو میں نے دیکھا کہ بدر کے موقع پر کفر کی حالت میں مارا گیا۔ امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "هٰذَا الشَّيْخُ هُوَ أُمَيَّةُ ابْنُ خَلَفٍ وَقَدْ قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ كَافِراً وَ لَمْ يَكُنْ أَسْلَمَ قَطُّ، وَ أَمَّا قَوْلُهُ سَجَدَ مَنْ كَانَ مَعَهُ فَمَعْنَاهُ مَنْ كَانَ حَاضِراً قِرَاءَ تَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْجِنِّ وَالإِنْسِ قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَغَيْرُهُ حَتّٰى شَاعَ أَنَّ أَهْلَ مَكَّةَ أَسْلَمُوا، وَأَمَّا مَا يَرْوِيهِ الْأَخْبَارِيُّونَ وَالْمُفَسِّرُونَ أَنَّ سَبَبَ ذٰلِكَ مَا جَرىٰ عَلىٰ لِسَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الثَّنَاءِ عَلىٰ آلِهَةِ الْمُشْرِكِينَ فِي سُورَةِ النَّجْمِ فَبَاطِلٌ لَا يَصِحُّ فِيهِ شَيْئٌ لَا مِنْ جِهَةِ النَّقْلِ وَ لَا مِنْ جِهَةِ الْعَقْلِ، لِأَنَّ مَدْحَ إِلٰهٍ غَيْرَ اللّٰهِ تَعَالىٰ كُفْرٌ وَ لَا يَصِحُّ نِسْبَةُ ذٰلِكَ إِلىٰ لِسَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا أَنْ يَقُولَهُ الشَّيْطَانُ عَلىٰ لِسَانِهِ وَلَا يَصِحُّ تَسْلِيطُ الشَّيْطَانِ عَلىٰ ذٰلِكَ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ."

یہ شخص امیہ ابن خلف تھا جو غزوہ بدر میں کفر کی حالت میں مارا گیا، وہ مسلمان نہیں ہوا اور یہ کہنا کہ جو لوگ ساتھ تھے انہوں نے سجدہ کیا، اس کا مفہوم یہ ہے کہ تلاوت کے وقت مسلمان مشرک جنات وانسان جو بھی حاضر تھے انہوں نے سجدہ کیا یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں یہ بات پھیل گئی کہ سب مسلمان ہوگئے اور یہ روایت کہ اس کا سبب یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے بتوں کے لئے توصیفی کلمات جاری ہوئے تو یہ باطل ہے عقلاً ونقلاً کسی طرح صحیح نہیں اس لئے کہ کسی بت کی تعریف اللہ تعالی کے نزدیک کفر ہے اس کی نسبت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا صحیح نہیں اور نہ ہی یہ کہنا صحیح ہے کہ

شیطان نے یہ کلمات آپ کی زبان سے ادا کرائے کیونکہ شیطان کا زبان پر قابو پانا صحیح نہیں۔

لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ دوران وحی اور دوران تلاوت شیطان جو چاہے نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلوانے پر قدرت رکھتا تھا، گویا پوری نبوت اور قرآن پاک اس ایک روایت کو تسلیم کرنے کی وجہ سے زد میں آجاتے ہیں اور ظاہر اًیہ محال ہے۔

بلکہ ایسے امور میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ راوی سے سماع میں تسامح ہوا ہے، ایسے موقع پر صحابہ کے تعامل سے یہی پتہ چلتا ہے، مثلاً فاطمہ بنت قیس صحابیہ ہیں انہیں ان کے شوہر نے طلاق دیدی ان کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں نان ونفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انہوں نے یہ روایت حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو نہیں چھوڑ سکتے جس کی نسبت ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس نے یہ واقعہ یاد رکھا ہے یا بھول گئی ہے۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۸۵)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب فاطمہؓ کی روایت کا ذکر آیا تو فرمانے لگیں "مَا لِفَاطِمَةَ خَيْرٌ ذَكَرَتْ هَذَا الْحَدِيْث" (بخاری ج ۱ ص ۴۸۵) اگر فاطمہ یہ حدیث بیان کرتی ہے تو پھر اس کے پاس کوئی خیر نہیں۔

قاسم ابن محمد کا بیان ہے کہ ام المؤمنین نے ایک بار فاطمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ کیا تو اللہ سے ڈرتی نہیں ہے۔ (بخاری ج ۲ ص ۸۰۳)

سوید ابن سعید صحیح مسلم کے ایک راوی ہیں انہوں نے ایک حدیث بیان کی جس نے عشق کیا اور اسے دل میں چھپائے رکھا اور پاک دامن رہا اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ شہید مرا' (زاد المعاد ص ۲۷۵ ج ۴) اس حدیث کی تخریج خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ ج ۵ ص ۱۵۶ اور ابن عساکر نے بھی کی ہے، یہی حدیث فرائطی کے طریق سے 'اعتدال القلوب' میں بھی آئی ہے، اسی طریق کی تضعیف علامہ ابن قیمؒ نے روضۃ الحسین ص ۱۸۴ ر یعقوب ابن موسیٰ کی وجہ سے کی ہے حافظ ابن القیمؒ زاد المعاد میں

اس روایت کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں: "فَلَوْ كَانَ إِسْنَادُ هَذَا الْحَدِيْثِ كَالشَّمْسِ كَانَ غَلَطاً وَ وَهَماً" (زادالمعاد ص ۲۷۶ ج ۴) اگر حدیث کی سند سورج کی طرح روشن بھی ہوتی تب بھی یہ روایت غلط ہی ہوتی، حتی کہ امام یحییٰ ابن معین نے اس روایت کے باعث سوید بن سعید کو کذاب قرار دیا ہے باوجود یہ کہ دیگر ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ابن حجرؒ نے صدوق فی نفسہ کہا ہے۔ (تقریب التہذیب)

صحیح مسلم کتاب الجہاد باب فی الفیٔ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس جھگڑتے ہوئے آئے، حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا "اقض بینی و بین هذا الكاذب الآثم الغادر الخائن" (ص ۹۰ ج ۲) میرے اور اس جھوٹے گنہگار غدار اور خائن کے مابین فیصلہ کر دیجئے، چونکہ ایک صحابی دوسرے صحابی کی شان میں اتنے رکیک الفاظ استعمال نہیں کر سکتا، اس لئے متعدد محدثین نے اپنے نسخہ میں یہ الفاظ خارج قرار دیے ہیں اور علامہ مازری اس کی نسبت لکھتے ہیں: "إذا فسدت طُرق تاويلها نسبنا الكذب إلى رواتها" (ص ۹۰ ج ۲) جب اس کی تاویل کے تمام راستے بند ہو جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا ہی کہیں گے۔

ان مذکورہ مباحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سند کے معتبر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت بھی صحیح ہو، بعض اوقات سند معتبر ہوتی ہے لیکن بعض وجوہات کی بناء پر روایت غلط ہوتی ہے، اس کے ساتھ یہ بات معلوم ہوئی کہ صحیحین میں ایسی روایتیں ہیں جن پر درایۃً کلام کیا گیا ہے، اور صحابہ کے تعامل سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

حدیث کے متقارب الفاظ

اس فن کے چار نام اور بھی ہیں روایت، اثر، خبر، سنت

جب لفظ حدیث کے ہم معنی، اور متقارب الفاظ محدثین کے سامنے آئے تو سوال پیدا ہوا کہ ان الفاظ میں کون سی نسبت ہے۔

روایت:۔ اس لفظ کا اطلاق بالاتفاق حدیث کے لغوی مفہوم پر ہوتا ہے، یعنی ہر طرح کی بات کو لغوی طور پر روایت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

خبر: خبر کے لفظی معنی مَا یُنْقَلُ، حدیث بھی نقل کی جاتی ہے اس مناسبت سے حدیث کو خبر کہتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ حدیث اور خبر کے درمیان کون سی نسبت ہے؟ بعض کے نزدیک تساوی کی نسبت ہے، جب کہ بعض کے نزدیک دونوں میں تباین کی نسبت ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا رجحان اسی طرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے حدیث بیان کرنے والے کو محدث، اور خبر بیان کرنے والے کو اخباری سے تعبیر کیا ہے، اس قول کے مطابق حدیث کو خبر کہنا صحیح نہیں، لیکن یہ قول خود صحیح نہیں، کیونکہ بکثرت احادیث کے لئے اخبار کا لفظ مذکور ہے بعض کے نزدیک دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے، خبر عام ہے جو دوسرے لوگوں کے اقوال وافعال کو بھی شامل ہے اور حدیث صرف آپ ﷺ کے اقوال کو شامل ہے۔ (مقدمہ مشکوٰۃ، ص:۱۰)

اثر: لغت میں اثر "بقية الشيء" کو کہتے ہیں، چونکہ کلام اللہ کے مقابلہ میں احادیث بقیہ ہیں اس لئے اس کا نام اثر رکھا گیا، یا اثر کے معنی نقل کے ہیں، اور حدیث بھی نقل کی جاتی ہے اس لئے اس کو اثر کہتے ہیں۔

حدیث اور اثر کے درمیان فرق کیا ہے؟ فقہاء خراسان کا خیال ہے مرفوع روایت کو حدیث، اور صحابہ وتابعین کی موقوف روایات کو اثر کہیں گے، گویا ان کے بقول

تباین کی نسبت ہے، حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب جس میں صرف موقوفہ روایات لکھی اور اس کا نام انہوں نے کتاب الآثار رکھا، جس سے بظاہر اس قول کی تائید ہوتی ہے، بعض نے دونوں کے درمیان عموم خصوص مطلق کی نسبت ذکر کی ہے کہ حدیث کا اطلاق صرف مرفوع پر، اور اثر کا مرفوع، موقوف، مقطوع تینوں پر ہوگا۔

لیکن جمہور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تساوی کی نسبت ہے، اور اس کی تائید بھی ہوتی ہے، مثلاً وہ ادعیہ جو آپ سے مرفوعاً منقول ہیں ان کو عرف میں ادعیہ ماثورہ کہا جاتا ہے، امام طحاوی نے حدیث کی مشہور کتاب لکھی جس میں مرفوع احادیث بھی ہیں اس کا نام معانی الآثار رکھا، اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب حدیث مشکل الآثار ہے، حافظ ابن جریر طبری کی تہذیب الآثار بھی ہے اس کا یہی حال ہے اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں ترادف کی نسبت ہے۔

سنت: سنت کے معنی "الطریقة المسلوکة فی الدین" یعنی دین کا وہ راستہ جس پر چلا جائے، چونکہ آپ کے اقوال افعال پر چل کر زندگی گذاری جاتی ہے، اس وجہ سے اسے سنت کہتے ہیں، ان دونوں کے درمیان نسبت کے سلسلے میں اختلاف ہے، بعض حضرات عموم خصوص مطلق کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ حدیث اقوال کے لئے خاص ہے، اور سنت عام ہے، اقوال وافعال دونوں کے لئے مستعمل ہے، بعض نے بالکل برعکس کہا کہ حدیث عام اور سنت خاص ہے لیکن صحیح قول تساوی کا ہے کیونکہ کتب حدیث میں سنن نامی مشہور کتب ہیں حالانکہ ان میں فعلی روایات کیساتھ قولی بھی بکثرت ہیں، معلوم ہوا کہ ترادف کی نسبت ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام الفاظ محدثین کے نزدیک مترادف ہیں اور ایک دوسرے کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ (إنهاء السكن مقدمة إعلاء السنن ص۲۰،۱۹)

اقسام حدیث اور ان کا ماخذ ''قرآن''

حضرات محدثین نے حدیث کی بنیادی طور پر دو قسمیں کی ہیں: (۱) خبر متواتر (۲) خبر آحاد۔ پھر خبر آحاد کی تین قسمیں کی ہیں مشہور، عزیز، غریب۔ یہ کل چار قسمیں ہوئیں جو اصول حدیث میں ذکر کی گئی ہیں، البتہ اور اقسام تو وہ ذیلی اور ضمنی ہیں جو انہیں چار سے نکلے ہوئے ہیں۔

ان چار قسموں پر غور کریں تو ان سب کا ماخذ قرآن ہی ہے، مثلاً خبر متواتر کی حجیت کا ثبوت، خود قرآن کا وجود ہے جس کی روایت و تلاوت کا طریقہ ہی متواتر ہے، اگر متواتر سے انکار کر دیا جائے تو قرآن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ ایسے ہی وہ حدیث جس کی روایت اتنی بڑی تعداد نے کی ہو، جن کا کسی جھوٹ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو، اسے متواتر کہتے ہیں۔

خبر مشہور: ۔ اس روایت کو کہتے ہیں جو کم از کم تین ثقہ راویوں سے منقول ہو، اس کی حجیت قرآن کریم کی اس آیت سے ثابت ہے جو اصحاب القریہ کے تذکرہ میں سورہ یٰسین میں مذکور ہے۔

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُمْ مُرْسَلُونَ﴾. (سورہ یٰسین: ۱۳-۱۷)

اہل انطاکیہ کے پاس حق تعالیٰ نے دو شخص کو رسول بنا کر بھیجا ان لوگوں نے ان دونوں کی تکذیب کر دی، خداوند قدوس نے ان دو رسولوں کی تقویت کے لئے تیسرے شخص کو بھیجا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ دو کی تکذیب کر دینے کے بعد تیسرے کا اضافہ اصولاً اس وجہ سے تھا کہ عادۃً تین ثقہ اور عادل افراد کو جھٹلانا فطرت انسانی کے خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سے گاؤں والوں پر حجت تمام ہوگئی، معلوم ہوا کہ کسی بات کو تین آدمی متفقہ طور پر بیان کریں تو وہ قابل حجت ہے۔

ممکن ہے یہ سوال اٹھایا جائے کہ ہماری بحث تو راویوں کے سلسلہ میں ہے اور دلیل میں انبیاء کو پیش کیا گیا ہے، کیا غیر نبی، نبی کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت نقل و روایت کے سلسلہ میں تین کا عدد پیش نظر ہے رسالت کی صفت پیش نظر نہیں کیونکہ ایک رسول بھی ثقاہت و عدالت، اور صدق و امانت میں ساری دنیا سے بڑھ کر ہوتا ہے، اہل انطاکیہ نے ان دونوں کی تکذیب اس بنا پر نہیں کی تھی کہ وہ دونوں رسول ہیں، بلکہ راوی اور ناقل سمجھ کر کیا تھا، لہٰذا جب خبر مشہور قرآن کی اس آیت سے مستفاد ہے تو اس آیت کو ماننا، خبر مشہور کے ماننے کو مستلزم ہے، اور خبر مشہور کا انکار اس آیت کے انکار کو مستلزم ہے۔

خبر عزیز:۔ اس روایت کو کہتے ہیں جس کو کم از کم دو ثقہ راوی روایت کریں، دو ثقہ انسان کی نقل و خبر قرآن کی نگاہ میں معتبر ہے، ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ دوسری جگہ ہے ﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ﴾ یعنی دو کی شہادت صرف معتبر ہی نہیں بلکہ حجت بھی ہے جس پر دین و دنیا کے ہزار ہا جانی، مالی اخلاقی اور معاملاتی چیزوں کا دارومدار ہوتا ہے، اور انہیں دو پر فیصلے بھی ہوتے ہیں حتی کہ دو کی شہادت کے بعد قضائے قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے، جب دو کی شہادت حجت ہے تو دو ثقہ راوی کی روایت بدرجۂ اولیٰ حجت ہوگی، کیونکہ شہادت کی شرط سخت ہے اس میں حریت، عدد، عدالت اور ذکور کا ہونا لازم ہے جبکہ حدیث میں سوائے عدالت کے باقی مذکورہ چیزیں مشروط نہیں، غرض جب دو کی شہادت معتبر ہے تو دو کی خبر بدرجۂ اولیٰ معتبر ہونی چاہئے، اس لئے کہنا پڑے گا کہ خبر عزیز کی حجیت کا ثبوت قرآن کی مذکورہ بالا آیتوں سے فراہم ہوتا ہے۔

خبر غریب:۔ جس روایت کے بیان کرنے والا ایک فرد ہو، اس کو خبر غریب، اور خبر فرد کہتے ہیں، خبر فرد کے ثبوت اور اس کے حجت ہونے میں ایک نہیں بیسیوں آیتیں پیش کی جاسکتی ہیں، ان میں چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) سارے انبیاء کے پاس حضرت جبرئیل تنہا وحی لے کر آتے تھے، پورا قرآن تنہا وہ لے کر آئے، اگر ایک کی خبر قابل حجت نہ ہوتی تو انبیاء کے پاس صرف ایک فرشتہ کو نہ بھیجا جاتا۔

یہاں بھی وہی اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہماری بحث تو راویوں کے سلسلہ میں ہے، اور دلیل میں فرشتہ کو پیش کیا جا رہا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند قدوس نے حضرت

جبرئیل کی بات یہ کہہ کرنہیں منوائی کہ یہ فرشتہ ہے بلکہ اصول کی کسوٹی پر جانچ کران کی بات تسلیم کرنے کی ہدایت فرمائی، کہ جبرئیل میں عدالت، ضبط، امانت وغیرہ جیسے اوصاف قبولیت ہیں یانہیں؟ایک جگہ قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا کہ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِيْ الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ﴾ اس آیت میں واضح کردیا گیا کہ قرآن کی روایت، اورخبر فرد، ان کے فرشتہ ہونے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں ہوتی، بلکہ اس بناء پر کہ راویوں کے تمام اوصاف اور محاسن روایت ان میں جمع ہیں، اور تمام مطاعن روایت سے پاک وصاف ہیں جیسا کہ لفظ رسول کریم، ذی قوۃ، مطاع، امین وغیرہ سے واضح ہے۔

(۲) اہل انطاکیہ کے علاوہ باقی تمام امت کے پاس، ان کی ہدایت کے لئے ایک ایک ہی نبی آتے رہے جیسا کہ ﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ نُوْحٌ، إِذْ قَالَ لَهُمْ هُوْدٌ، إِذْ قَالَ لَهُمْ لُوْطٌ﴾ سے ظاہر ہے یہاں بھی سرسری طور پر وہی اعتراض قائم کیا جاسکتا ہے کہ دعوی راویوں کے بارے میں ہے جو غیر رسول ہیں، اور دلیل میں رسول کو پیش کیا جارہا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رسول کی بات اس حیثیت سے نہیں منوائی کہ یہ رسول ہیں، بلکہ اصول کی کسوٹی پر جانچ کر ماننے کی ہدایت کی، چنانچہ قرآن میں ہے ﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى﴾ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں ''صاحب'' کہا ''رسول'' نہیں کہا اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ محمد ایک زمانۂ دراز تک تمہارے ساتھ رہے، ان کے حالات زندگی کے واقعات عیاں ہیں کیا تم نے ان کے اندر نفس پرستی وغیرہ کے اوصاف مشاہدہ کئے ہیں؟ اگر ایسی بات نہیں بلکہ تم کفار خود ان کی امانت، دیانت اور صداقت کے معترف ہو، تو جو انسان، انسان پر جھوٹ نہیں بول سکتا وہ خدا پر جھوٹ کیسے بول سکتا ہے، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ رسول جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قابل قبول ہے کیونکہ قبولیت کے اوصاف ان میں موجود ہیں۔

(۳) ﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يَا مُوْسٰى إِنَّ الْمَلَاءَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ إِنِّيْ لَكَ مِنَ النَّاصِحِيْنَ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ﴾ (القصص)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک انسان کی خبر مان لی، بلاشبہ یہ خبر واحد، اور خبر غریب تھی جبکہ اسی خبر پر متاثر ہوئے، اور مصر سے باہر نکل گئے، اگرچہ حضرت موسیٰ کا یہ فعل نبوت سے پہلے کا ہے، لیکن قرآن نے اس کو بیان کیا ہے اور ان کے اس فعل پر سکوت کیا ہے، اگر خبر فرد کو ماننے کی صورت میں ان کا یہ عمل غلط ہوتا، تو قرآن میں اس کی صراحت ہوتی، معلوم ہوا کہ ایک آدمی کی بات اگر قرائن سے اس کا ثقہ اور عادل ہونا معلوم ہو جائے تو یہ قرآن کی روشنی میں صحیح ہے۔

(۴) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ معلوم ہوا کہ تحقیق و تفتیش کے بعد جب ایک فاسق کی خبر بھی مانی جا سکتی ہے تو عادل کی خبر کیونکر قابل حجت نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ حضرات محدثین کسی راوی کی پوری تحقیق کے بعد ہی اس کی روایت کو معتبر مانتے ہیں۔ الحمد للہ کہ حدیث کے بنیادی اقسام کی حجیت کا ثبوت قرآن سے نکل آیا۔ (فتح الملہم ص ۱/۶)

صحاح ستہ کی شرطیں اور فرق مراتب

محدثین نے حدیث کی بے شمار کتابیں لکھی ہیں ان میں چھ کتابوں کو ماخذ کا درجہ حاصل ہے، لیکن صحاح ستہ کے نام سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ ان کتابوں کی ہر حدیث صحیح ہے، اور اس کے علاوہ صحیح نہیں، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں بلکہ غلط ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بخاری و مسلم کے علاوہ کی نہ تو ہر حدیث صحیح ہے اور نہ ان سے باہر کی ہر حدیث ضعیف ہے، صحاح ستہ کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پڑھ لینے کے بعد اصول دین سے متعلق صحیح روایات کا ایک بڑا ذخیرہ آجاتا ہے جو دین کے معاملات میں کافی ہو، بہر حال ان چھ کتب حدیث کو تلقی بالقبول کا درجہ حاصل ہے اس لئے یہ دیکھنا ہے کہ ان حضرات نے کن شرطوں کو سامنے رکھ کر یہ ذخیرہ حدیث جمع کیا ہے لیکن پریشانی یہ ہے کہ خود ان محدثین نے صراحت نہیں فرمائی کہ ان کے سامنے اخذ روایت کے کیا شرائط ہیں البتہ بعد کے لوگوں نے ان کے اسلوب کو پیش نظر رکھ کر ان شرائط کا استنباط کیا ہے۔

(۱) چنانچہ امام بخاریؒ کے یہاں کسی بھی حدیث کو لینے کے لئے سب سے سخت شرطیں ہیں کہ وہ صحیح کی شرائط پر پوری اترتی ہوں نیز رواۃ خمسہ (جس کی تفصیل صفحہ ۱۲۶ پر آرہی ہے) میں سے صرف پہلے طبقہ کی احادیث کو مستقل ذکر کرتے ہیں البتہ دوسرے طبقہ کی احادیث کبھی کبھی محض بطور استشہاد لے آتے ہیں۔

حافظ مقدسیؒ نے تو یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام بخاریؒ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ صرف ان راویوں کی روایت لاتے ہیں جن کے ثقہ ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہو، لیکن ایسا نہیں یہی وجہ ہے کہ امام حازمی نے اس کی تردید کی ہے، اور بعض نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بخاری شریف کے اسّی (۸۰) راوی ایسے ہیں جن کے اوپر کسی نہ کسی نے کلام کیا ہے، نصب الرایہ میں تفصیل موجود ہے۔

بخاری شریف کے بارے میں عام ذہن یہی ہے کہ حدیث غریب اس میں نہیں، حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اس کی پہلی حدیث "إنما الأعمال" الخ اور سب سے آخری حدیث "كَلِمتَان حَبِيبتَان" الخ بھی غریب ہے۔

(۲) امام مسلم بھی صحیح حدیث کے ذکر کرنے کا التزام کرتے ہیں، لیکن امام بخاریؒ کے مقابلہ میں تین اعتبار سے نرم ہیں، امام بخاریؒ کے برخلاف دوسرے طبقہ کے راویوں کی حدیث بلا تکلف لاتے ہیں اور تیسرے طبقہ کی روایت تائیداً ذکر کرتے ہیں، امام بخاریؒ کے یہاں حدیث معنعن کی صحت کے لئے راوی اور مروی عنہ کے درمیان لقاء وسماع ضروری ہے، اس کے بغیر روایت اخذ نہیں کرتے، جبکہ امام مسلم اس قسم کی حدیث کی صحت کے لئے محض راوی کا مروی عنہ کے معاصر ہونا کافی قرار دیتے ہیں، تیسرا فرق یہ ہے کہ امام مسلم راویوں پر جرح ونقد کے سلسلہ میں نرم ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض ان راویوں سے بھی روایت نقل کی ہے جن سے امام بخاری نے ترک کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بخاری کے مقابلہ میں مسلم میں متکلم فیہ راوی کی تعداد ایک سو اسّی (۱۸۰) ہے۔

(۳) امام نسائی پہلے تین طبقوں کی روایت کو مستقلاً لاتے ہیں۔

(۴) جبکہ امام ابوداؤد تینوں طبقوں کے ساتھ بطور استشہاد طبقۂ رابعہ کی بھی روایات لاتے ہیں۔

(۵) امام ترمذی چوتھے طبقے کی روایات مستقلاً اور بعض جگہ پانچویں طبقہ کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

(۶) ابن ماجہ نے ان پانچوں طبقہ کی روایات بلا تکلف اور مستقلاً ذکر کی ہیں۔

فرق مراتب: قوت سند کے اعتبار سے صحاح ستہ کی ترتیب یہ ہے۔

بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ بعض لوگوں نے مسلم کو بخاری پر ترجیح دی ہے شیخ ابومحمد تجیبی نے اپنی فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق لکھا ہے کہ

مسلم کو بخاری پر ترجیح دیا کرتے تھے، حافظ عبدالرحمٰن بن علی الربیع شافعی کا شعر ہے

تنازع قوم فی البخاری ومسلم
لدی وقالوا أي ذين تقدم
فقلت لقد فاق البخاری صحةً
كما فاق في حسن الصناعة مسلم (۱)

یعنی میرے سامنے بخاری ومسلم کے بارے میں کچھ لوگوں نے تنازعہ کیا، کہ ان میں کس کو فوقیت حاصل ہے تو میں نے کہا کہ صحت کے اعتبار سے بخاری کو فوقیت ہے، اور ترتیب ابواب وغیرہ میں امام مسلم ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔

من وجہ مسلم کو فوقیت دی جاسکتی ہے لیکن علی الاطلاق اصح کہنا اور اول درجہ دینا صحیح نہیں۔

صاحب کشف الظنون کا خیال ہے کہ ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں بحوالہ ذہبی نقل کیا ہے کہ اس کا رتبہ صحیحین کے بعد ہونا چاہئے تھا مگر اس کا مرتبہ اس لئے گھٹ گیا کہ اس میں مصلوب جیسے راویوں کی روایات آگئیں ہیں اور حافظ ابن حجر نے تقریب میں، اسی طرح تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب میں جو اشارات کیے ہیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ ابوداؤد اور نسائی کے درمیان اس کا مرتبہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا رجحان یہی ہے کہ ترمذی کا مقام پانچویں درجہ پر ہے نسائی شریف کی صحیح روایات چونکہ ابوداؤد کے مقابلہ میں زیادہ ہیں اس لئے اس کو اولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

ابن ماجہ: شروع میں (ابن ماجہ کے علاوہ) مذکورہ بالا کتب خمسہ صحاح کی اصطلاح سے مشہور ہوئیں، ابن ماجہ کو صحاح میں شامل نہیں کیا گیا، اسی بنا پر امام ابوبکر حازمی نے "شروط الأئمة الخمسة" تالیف فرمائی، بعد میں ابن ماجہ کو اس کی حسن ترتیب کی وجہ سے صحاح میں شامل کیا گیا، اور پھر صحاح ستہ کی اصطلاح قائم ہوئی۔

---

(۱) تہذیب التہذیب، ص:۳۴۰

حضرت شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ اگر صحاح میں چھ کتابوں کو داخل کرنا ہو تو ابن ماجہ کے بجائے موطأ امام مالک کو شامل کرلو، بعض حضرات نے صحاح ستہ میں دارمی کو شامل کیا ہے، کیونکہ ابن ماجہ میں ضعیف اور منکر روایتیں بلکہ بعض موضوع روایات بھی آ گئی ہیں بعض علماء نے ان کی تعداد انیس، بعض نے سترہ، بعض نے اکیس اور بعض نے پچیس بتلائی ہے، تاہم حسن ترتیب کی بنا پر صحاح ستہ میں اس کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: بعض حضرات مثلاً ابو الحجاج السری نے لکھا ہے کہ جس روایت میں ابن ماجہ متفرد ہوں وہ روایت ضعیف ہوگی، لیکن حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ میری تلاش وجستجو کے مطابق علی الاطلاق ایسا نہیں، اگرچہ فی الجملہ اس میں بہت سی منکر حدیثیں ہیں۔(۱)

مراتب روایت: مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ کتب حدیث ایک درجہ کی نہیں بلکہ راویوں کے فرق مراتب کے مطابق روایت میں فرق آتا ہے اس لحاظ سے روایات کے سات درجات قائم کئے گئے ہیں (۱) سب سے اعلیٰ جو صحیحین میں ہو (۲) وہ روایت جس کو بخاری نے ذکر کی ہو جس کو افراد بخاری کہتے ہیں (۳) جس کو امام مسلم نے نقل کی ہو جس کو افراد مسلم کہتے ہیں (۴) وہ روایت جو ان دونوں میں تو نہ ہو لیکن ان دونوں کے شرط کے مطابق ہو (۵) وہ جو صرف شرطِ بخاری پر ہو (۶) جو شرط مسلم پر ہو، شرط بخاری یا مسلم کا مطلب یہ ہے کہ راوی کے وہی صفات ہوں جو بخاری و مسلم کے راویوں کے صفات ہیں اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کی روایت کے سوا کوئی نئی روایت انہی دونوں کے راویوں سے مروی ہو (۷) اس کے بعد اس روایت کا درجہ ہوگا کہ جس کتاب میں صحیح روایت نقل کرنے کا التزام کیا گیا ہو۔(۲)

---

(۱) بستان المحدثین، ص: ۱۸۰، (۲) نخبۃ الفکر، ص: ۸۲

صحاح ستہ کے مقاصد

علم حدیث کے طلبہ کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ صحاحِ ستہ کن مقاصد کے پیش نظر مرتب ہوئی ہیں تا کہ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر کما حقہ استفادہ کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس پہلو پر بحث کی ہے کہ

(۱) امام بخاری کے مقاصد یہ تھے:

(۱) صحیح اور متصل السند روایتوں کو جمع کرنا، (۲) فقہی مسائل کو مستنبط کرنا، اس لئے جابجا موقوف، معلق، صحابہ کے فتاویٰ نقل کر کے مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔

(۳) حدیث کی تفسیر و معانی بتانا، اس لئے تراجم میں حدیث کی شرح کرتے ہیں، بخاری کے تراجم درحقیقت، فقہی مسائل کا مجموعہ ہے اگر کوئی سوال کرے کہ امام بخاری نے فقہ میں کون سی کتاب لکھی تو کہہ دو کہ بخاری کے تراجم ہی فقہی مسائل ہیں، مقولہ مشہور ہے "فقه البخاری فی تراجمه".

(۲) امام مسلم کا مقصد (۱) ان روایتوں کو جمع کرنا جن کے صحیح اور مرفوع ہونے پر ان کے زمانہ کے ائمہ حدیث کا اتفاق ہو، (۲) استنباطِ مسائل کے لئے مرتب طریقہ پر احادیث یکجا کرنا (۳) حدیث کی مختلف سندوں کو ذکر کرنا تا کہ اس کی وجہ سے متن اور سند کا اختلاف اچھی طرح سامنے آجائے، اور ایک موضوع سے متعلق تمام احادیث کو ان کے طرق صحیحہ کے ساتھ مرتب شکل میں جمع کر دیا جائے، حسن ترتیب کے لحاظ سے مسلم بے نظیر ہے اور اس میں تلاش حدیث بہت آسان ہے۔

(۳) امام ابوداؤد کا مقصد ان احادیث کو ذکر کرنا جن سے کسی فقیہ نے

کسی بھی فقہی مسئلہ پر استدلال کیا ہو، اسی لئے ایسی احادیث کو تمام طرق کے ساتھ یکجا ذکر کردیتے ہیں اور چوں کہ فقہاء کے مستدلات ذکر کرتے ہیں اس لئے امام مسلم کی طرح صحیح احادیث کی پابندی نہیں کرسکے، بلکہ وہ صحیح، حسن اور ان ضعیف احادیث کو لے آتے ہیں جو قابل عمل ہو، البتہ جو ناقابل عمل روایت ہو اس کو ذکر نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو قال ابوداؤد کہہ کر اس کے نکارت کو ظاہر کردیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں سکوت اختیار کریں وہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے۔

(۴) **امام ترمذی** ان کا پہلا مقصد تو وہی ہے جو بخاری اور مسلم کا ہے یعنی صحیح احادیث کو جمع کرنا، (۲) ان کے مقاصد میں امام ابوداؤد کا مقصد بھی داخل ہے یعنی ان احادیث کو ذکر کرنا جو مسائل فقہیہ کے متعلق ہیں گویا ان کا مقصد ہر فقیہ کے مستدل کو جداگانہ باب میں ذکر کرنا ہے، لیکن ایک موضوع کی احادیث کا استیعاب نہیں کرتے بلکہ عموماً صرف ایک حدیث لاتے ہیں اور حدیث بھی حتی الامکان وہ ذکر کرتے ہیں جو دوسرے ائمہ نے تخریج نہیں کی، اور اس موضوع کی باقی احادیث کی طرف "وفی الباب عن فلان و فلان" کہہ کر اشارہ کرتے ہیں اور اسناد کی علتوں پر اشارہ کے ساتھ مذاہب فقہاء صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(۵) **امام نسائی** کا مقصد تالیف زیادہ تر علل اسانید بیان کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر باب کے شروع میں وہ حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں ان کے نزدیک کوئی علت ہو، ان علتوں کو بیان کرنے کے بعد وہ حدیث لاتے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح ہو، اسی کے ساتھ استنباط احکام بھی پیش نظر رکھتے ہیں مگر یہ انداز بہت لطیف ہوتا ہے، اسی لئے اس کے تراجم اپنی دقت نظر کے اعتبار سے بخاری کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔

(۶) **امام ابن ماجہ**: ان کا انداز امام ابوداؤد کے انداز و مقاصد سے ملتا جلتا ہے، فرق اگر ہے تو یہ کہ ان کے یہاں صحت و حسن کا وہ اہتمام نہیں جو ابوداؤد کے یہاں ہے۔

کتب حدیث کی قسمیں

محدثین نے مختلف انداز اور مختلف حیثیت سے کتابیں لکھی ہیں، چنانچہ بعض محدثین نے مضامین کے لحاظ سے کتب حدیث لکھیں، اور پھر ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا۔

جامع، سنن، معجم، مسانید، افراد، مستدرک، مستخرج، جزء۔

جامع:۔ اس کتاب حدیث کو کہتے ہیں جس میں آٹھ مضامین سے متعلق احادیث جمع کر دی گئی ہوں، ان مضامین کو شعر میں اس طرح کہا گیا ہے ۔

سیر و آداب و تفسیر و عقائد　　　فتن و اشراط و احکام و مناقب

سنن:۔ وہ کتاب حدیث جس میں ابواب فقہیہ کی ترتیب پر احادیث احکام جمع کی گئی ہوں، جمع احادیث کے ابتدائی دور میں ایسی کتابوں کو ابواب کہا جاتا تھا، بعد میں نام بدل کر مصنف کہا جانے لگا، لیکن پھر جلد ہی سنن کے نام سے معروف و مشہور ہو گئیں، صحاح ستہ میں جہاں سنن اربعہ بولتے ہیں تو اس سے نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ یہ کتابیں مراد ہوتی ہیں اسکے علاوہ اور بھی سنن کے نام سے کتابیں ہیں مثلاً سنن دارقطنی، دارمی، بیہقی، سعید بن منصور۔

معجم:۔ وہ کتاب حدیث جس میں اساتذہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں جمع کی گئی ہوں یعنی ایک شیخ کی ساری حدیث ایک جگہ ذکر کر دی جائیں، لیکن حضرت شیخ زکریا فرماتے تھے، کہ یہ تعریف صحیح نہیں بلکہ معجم ان کتب حدیث کو کہیں گے جن میں حروف تہجی کی ترتیب پر احادیث جمع کی گئی ہوں خواہ وہ ترتیب صحابہ کرام کی ہو یا شیوخ کی، معاجم تو کئی ہیں لیکن امام طبرانی کی تین معجم، "المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، المعجم الصغیر" کے نام سے مشہور ہے۔

مسانید:۔ وہ کتب حدیث جن کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا ہو یعنی ایک صحابی کی تمام مرویات ایک ہی جگہ ہو خواہ کسی بھی باب سے متعلق ہو، اب صحابہ کی ترتیب میں کبھی تو افضل فالافضل کا اعتبار کرتے ہوئے نام لاتے ہیں، اور کبھی سبقت فی الاسلام یا حروف تہجی کے اعتبار سے ذکر کرتے ہیں، عام طور پر تین مسند زیادہ معروف و مشہور ہیں مسند امام احمد، مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی۔

مشیـــــخة: اس کتاب حدیث کو کہیں گے جس میں صرف کسی ایک یا چند شیوخ کی احادیث جمع کر دی گئی ہوں۔

افـراد: وہ مجموعہ حدیث جس میں کسی ایک شخص یا صرف کسی ایک شہر کے لوگ بیان کرنے میں متفرد ہوں۔

مستدرك: محدثین نے اپنی کتب حدیث میں جن شرطوں کو ملحوظ رکھ کر احادیث مرتب کی ہیں، پھر بھی ان شرطوں کے مطابق ہونے کے باوجود بہت سی احادیث ان کتابوں میں نہ آسکیں، ایسی احادیث کو بعد میں لوگوں نے جمع کیا، تو ایسے مجموعہ کو مستدرک کہتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور مستدرک حاکم ہے جس میں انہوں نے ان روایتوں کو جمع کیا ہے جو صحیحین میں نہیں لیکن ان کے زعم کے مطابق وہ علی شرط الشیخین ہیں۔

مستـــخـرج: وہ کتاب حدیث جس میں کسی بھی کتاب حدیث کو اپنی ایسی سند سے روایت کیا جائے کہ اس کتاب کے مصنف کا واسطہ نہ آتا ہو، یہ کام مسلم شریف پر ہو مثلاً مستخرج ابی عوانہ علی صحیح مسلم، مستخرج ابی نعیم علی صحیح مسلم ان دونوں کے مصنف نے مسلم کی روایتوں کو ایسی سند سے نقل کیا ہے کہ اس میں امام مسلم کا واسطہ نہیں آتا۔

جزء: وہ کتاب جس میں کسی خاص مسئلہ سے متعلق احادیث ہوں، جیسے "جزء القراءة للبخاری، جزء رفع الیدین، جزء الجهر ببسم الله للدار قطنی" حضرت شیخ زکریا کی جزء حجة الوداع وغیرہ۔

تحمل حدیث کی قسمیں

شیخ سے احادیث حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں، اپنے شیخ سے احادیث حاصل کرنے کو محدثین کی اصطلاح میں تحمل کہتے ہیں اور ان کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) **قراءۃ علی الشیخ**:۔ اس سے مراد وہ طریقہ ہے جو فی زماننا رائج ہے، یعنی شاگرد الفاظ حدیث پڑھے اور استاذ سنے، اس صورت میں شاگرد جب روایت کہیں اور بیان کرے گا تو "حدثني"، "أخبرني"، "أنبأني"، "قرأت عليه" کے صیغے استعمال کرے گا، اور اگر پوری جماعت شریک درس رہی تو صیغہ جمع یعنی "أخبرنا"، "أنبأنا" کہنا ہوگا، بعض حضرات نے دونوں میں فرق کیا ہے کہ جماعت سے جو شخص پڑھ رہا ہو وہ تو "أخبرنا" کہے اور جو سن رہے ہیں وہ "أنبأنا" کہیں گے۔

(۲) **السماع**:۔ اس سے مراد یہ ہے کہ الفاظ حدیث استاد پڑھے اور شاگرد سنے اسکو سماع عن الشیخ سے تعبیر کرتے ہیں، اس صورت میں شاگرد کے لیے "حدثني"، "أخبرني"، "سمعت فلانا" کے صیغے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

یہاں ایک اختلاف یہ ہے کہ "سماع" اور "قراءت علی الشیخ" ان دونوں میں سے کون سا طریقہ افضل ہے؟ حضرت امام شافعیؒ اور امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ سماع کو افضل قرار دیتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ "قراءت علی الشیخ" کو افضل کہتے ہیں، بظاہر یہ شکل محتاط نظر آتی ہے کہ اگر تلاوت میں شاگرد غلطی کرے تو استاد اس کو ٹوک سکتا ہے اور اگر شیخ پڑھے تو ممکن ہے شاگرد کی توجہ میں کمی آجائے، اور اس کے علاوہ اگر شیخ سے سبقتِ لسانی ہوگئی تو شاگرد شیخ کی ہیبت کی وجہ سے ان کو نہ ٹوکے اور وہ غلطی اپنی جگہ باقی رہ جائے۔

قول فیصل وہ بات ہے جو حافظ ابن حجرؒ اور حافظ سخاویؒ نے بیان کیا ہے کہ اصل

ہے امکانِ غلطی سے بچنا، اور حالات مختلف ہوا کرتے ہیں جہاں جو شکل مامون عن الخطا ہو وہاں وہی اقویٰ اور افضل ہوگا، لہٰذا فیصلہ یک طرفہ نہ ہونا چاہئے۔

متقدمین اور متاخرین کے درمیان ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ جب زمانہ قدیم سے قراءت علی الشیخ اور سماع دونوں طریقے رائج ہیں تو جب شاگرد دوسروں کے سامنے حدیث نقل کرے تو کن الفاظ کے ذریعہ؟ کیا دونوں صورت کے لئے ہر کوئی لفظ استعمال کر سکتے ہیں یا الگ الگ الفاظ؟

متأخرین کہتے ہیں سماع عن الشیخ کی صورت میں لفظ حدثنا استعمال کرنا ہوگا، اور قراءت علی الشیخ کی صورت میں اخبرنا، یہی مسلک امام شافعی، اکثر محدثین، ابن جریج، اوزاعی، ابن وہب، امام نسائی اور امام مسلم کا ہے، ان حضرات کے یہاں ان دونوں کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرنا جائز ہی نہیں۔

متقدمین جن میں ابن شہاب زہری، امام مالک، سفیان بن عیینہ، یحیی بن سعید القطان، امام بخاری اور اکثر اہل حجاز اور اہل کوفہ، ان حضرات کا خیال ہے کہ حدثنا اور اخبرنا کے درمیان کوئی فرق نہیں، ایک کو دوسرے کی جگہ پر بلا تأمل استعمال کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں امام مسلم نے انتہائی احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ ہر صیغہ کو اپنے اپنے موقعہ پر ہی استعمال کیا ہے چنانچہ استاد نے پڑھا اور سننے والا ایک شاگرد ہو تو حدثنی، اور پوری جماعت ہو تو حدثنا کہتے ہیں، اور اگر شاگرد پڑھے استاد سنے اور شاگرد تنہا ہو تو اخبرنی، اور پوری جماعت ہو تو اخبرنا کہیں گے، پھر اختصار کی بناء پر عام محدثین حدثنی کے بجائے ثنی، حدثنا کے بجائے ثنا، اخبرنا کے بجائے انا، انبأنا کے بجائے نبأ لکھتے ہیں۔

(۳) المراسلة أو المكاتبة: یعنی استاد و شاگرد میں سے کوئی کسی کے سامنے روایت نہ پڑھے نہ سنے، بلکہ کوئی استاد خط میں کوئی حدیث لکھ کر کسی کے پاس بھیج دے اس صورت میں یہ اختلاف ہے کہ ایسے خط میں روایت پڑھ کر شاگرد کے لئے کب روایت بیان کرنا درست ہوگا؟ ایک قول یہ ہے کہ جب تک اس میں صراحۃً اس

روایت کو شیخ کے واسطے سے نقل کرنے کی اجازت نہ ہو اس وقت تک جائز نہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ صراحۃً اجازت کا ہونا ضروری نہیں البتہ "حدثنی"، "أخبرنی" کا لفظ استعمال نہیں کرسکتا بلکہ "کتبنی"، "کتبَ إلیّ" یا "أرسل إلیّ" استعمال کرنا ہوگا۔

المناولة: یعنی شیخ اپنے شاگرد کو اپنی روایات کا مجموعہ سپرد کردے، یہاں بھی بعض حضرات کے بقول شیخ کی صریح اجازت کے بعد ہی اس کو نقل کرنا جائز ہوگا لیکن معتمد بات یہ ہے کہ شاگرد کو اگر یقین ہو کہ روایت بیان کرنے کے لیے ہی شیخ نے دیا ہے تو اس کے لئے بیان کرنا درست ہے، البتہ "حدثنی" وغیرہ کے لفظ کے بجائے "ناولنی" کہنا ہوگا۔

الوجادة: یعنی کسی شیخ کی مرویات کا وہ مجموعہ جو خود اس شیخ کے بجائے کسی دوسرے اور طریقہ سے حاصل ہو جائے، تو اس کے بارے میں بیشتر محدثین کا مسلک ہے کہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے موضوع روایت، یا معلول روایت کو یاد رکھنے کے لئے لکھا ہو، بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر شیخ کے خط پر اعتماد ہو تو "وَجَدْتُ بِخَطِّ فُلَان" کے الفاظ کے ذریعہ روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کا مقدمہ فتح الملہم قابل دید ہے انہوں نے نقل کیا ہے کہ مسلم شریف میں بطریق وِجادَۃ روایت مروی ہے۔

تدوین حدیث کب اور کس طرح

حدیث کا اتنا بڑا ذخیرہ کب اور کس طرح مدون ہوا، اور کتابت حدیث کا سلسلہ کب شروع ہوا، تدوین حدیث کے وہ پہلو جن کا ہر طالب علم کو جاننا ضروری ہے۔

کتب احادیث میں جب ہم صحابہ کرام کی تدوین حدیث کی انفرادی کاوشوں کو دیکھتے ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ کتابت حدیث اور تدوین حدیث کی داغ بیل عہدِ رسالت، اور خلفاء اربعہ ہی کے زمانہ میں پڑ چکی تھی، چنانچہ احادیث کی ایک معتد بہ تعداد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے املاء کرائی ہے، یا پھر آپ کی ہدایت پر تحریری شکل میں محفوظ کی گئی، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کا ایک مجموعہ ''الصادقہ'' نامی املا کرایا، جس میں زکوٰۃ، عشر، صدقات وغیرہ کے احکامات تھے، ابھی آپ گورنروں کے پاس ارسال نہ فرما سکے کہ دنیا سے رحلت فرما گئے اس مجموعہ حدیث پر حضرت ابوبکرؓ نے ان کے بعد حضرت عمرؓ نے عمل کیا، ان کے انتقال کے بعد ان کے دو صاحبزادے حضرت عبداللہ، اور حضرت عبید اللہ کے پاس وہ مجموعہ پہونچا، پھر وہی مجموعہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس پہونچا پھر ان سے حضرت سالم نے اخذ کیا اور ان سے حضرت ابن شہاب زہری نے حاصل کیا، اس مجموعہ کے بارے میں حضرت ابن شہاب زہری کہا کرتے تھے کہ یہ متن اس مجموعہ کا ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کرایا ہے، اور اس کا اصل مخطوطہ حضرت ابن عمرؓ کے لڑکوں کے پاس ہے اور حضرت سالم نے حضرت عبداللہ سے اس کی ایک نقل حاصل کی تھی وہی نقل میرے پاس ہے۔(۱)

اکثر مضمون از مرتب، تدوین حدیث کے لئے معرکۃ الآراء کتاب حضرت مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''تدوین حدیث'' دیکھئے اکثر مضمون وہیں سے ماخوذ ہے۔

---

(۱) حجیت حدیث ص ۱۳۲

(۲) ۱۰ھ میں جب نجران فتح ہوا تو آپ ﷺ نے عمرو بن حزم کو وہاں کا گورنر متعین فرمایا اور حضرت ابی ابن کعب کے ذریعہ تفصیلی خط لکھوا کر گورنر کو ارسال فرمایا اس میں طہارت، نماز، عشر، زکوۃ، حج، عمرہ، جہاد، مال غنیمت، دیت وغیرہ سے متعلق احکام ومسائل تھے ان کے انتقال کے بعد وہ مجموعہ ان کے پوتے حضرت ابوبکر کے پاس رہا، ابن شہاب زہری نے بھی وہ مجموعہ ان سے پڑھا بلکہ اپنے شاگردوں کو پڑھایا کرتے تھے اس نوشتہ کے جستہ جستہ ٹکڑے احادیث وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔(۱)

(۳) مدینہ منورہ سے دور بسنے والے قبائل جب مشرف باسلام ہوتے تو اپنے وفود حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجتے، یہ وفود یہاں آکر اسلامی تعلیم واحکام حاصل کرتے اور وطن واپسی کے موقعہ پر درخواست کرتے کہ ان کے قبائل کے لئے مجھے ضروری دستور حیات لکھوا دیں آپ ان کی درخواست قبول فرماتے اور وہ امور املا کروا دیتے جو ان کے لئے موزوں ومناسب ہوتے، چنانچہ وائل بن حجر کا واقعہ مذکور ہے کہ جب یمن سے تشریف لائے تو وطن واپس ہونے سے قبل درخواست پیش کی ''اُكْتُبْ لِيْ إِلٰى قَوْمِيْ كِتَابًا'' یعنی میرے لئے ایک صحیفہ لکھوا دیجئے جس میں میرے قبیلے کے لئے خطاب ہو۔(۲)

(۴) اسی طرح منقذ بن حیان جب مشرف باسلام ہوئے تو ان کو حضور اکرم ﷺ نے ایک دستاویز عنایت فرمایا جس سے ان کا پورا قبیلہ عبدالقیس مسلمان ہوا۔(۳)

(۵) فتح مکہ کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تفصیلی خطبہ دیا جس میں انسانی حقوق پر مشتمل کئی احکامات شامل تھے، مجمع میں ایک یمنی شخص نے جس کا نام ابوشاہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ ان کے لئے تحریری شکل میں مہیا کر دیا جائے، چنانچہ آپ نے فرمایا" اُكْتُبُوْا لِأَبِيْ شَاهٍ" (۴)

---

(۱) الوثائق السياسية في الإسلام ص ۱۰۹ (۲) طبقات ابن سعد ص ۱/۲۸

(۳) نووی ص ۳۳ (۴) بخاری ص ۱/۲۲

مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات، احادیث مبارکہ حسب موقعہ املا کرائے ہیں تا کہ محفوظ ہو جائیں۔

اس کے بعد اب دیکھیں کہ صحابہ کرام نے انفرادی طور پر تدوین احادیث کی کیا کاوشیں کیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں جس قدر احادیث سنتا تھا ان کو لکھ لیا کرتا تھا کسی قریشی بھائی نے مجھے ٹوکا، کہ آپ سے بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں نکلتی ہیں اس لئے نہ لکھا کرو، میں ان کے کہنے پر رک گیا مگر بعد میں جب میں نے اس کا تذکرہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ لکھا کرو، کیونکہ اس زبان رسالت سے کسی بھی حالت میں ناحق بات نہیں نکل سکتی، اس کے بعد تو ان کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا جس کا نام انہوں نے "الصادقة" رکھا تھا۔(۱)

حضرت ابو ہریرۃ جن کا شمار مکثرین صحابہ میں ہے اور ان کی تعداد روایت ۵۳۷۴/ ہے، فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ احادیث کسی کے پاس نہیں سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، اور وجہ یہ ہے کہ وہ لکھ لیا کرتے ہیں اور میں لکھتا نہیں۔(۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس صحیفے کا نام "الصادقه" اس لئے رکھا تھا کہ ان کے پاس ایک اور صحیفہ تھا جس کا نام انہوں نے "الصحيفة اليرموكية" رکھا تھا، چونکہ یرموک سے ان کو اسرائیلیات کے کچھ ذخیرے ہاتھ لگ گئے تھے، جبکہ اسرائیلیات سچ اور جھوٹ کا مجموعہ، اور اس کی بابت فرمانِ رسول "لا تصدق ولا تكذب" وارد ہے اس کے برعکس احادیثِ رسول تمام سچی، اس لیے اس کا نام "الصادقه" رکھا تا کہ احادیث رسول کا مجموعہ اس صحیفہ سے ممتاز ہو جائے۔(۳)

ابن اثیر کا بیان ہے "الصادقه" میں ایک ہزار احادیث تھیں۔

---

(۱) ابوداؤد شریف ص ۱/۵۱۳ (۲) بخاری ص ۱/۲۲ (۳) فتح الباری

''لیکن یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ تب تو حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے مقابلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی مرویات زیادہ ہونی چاہئے، حالانکہ ان کی مرویات اتنی نہیں ملتیں اس کی کیا وجہ ہے؟

حافظ ابن حجر نے اس کے مختلف جوابات نقل کئے ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے الفاظ ''إلا ما كان من عبد الله بن عمرو'' میں الا استثناء منقطع ہے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھ سے زیادہ کسی کے پاس روایت نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کتابت حدیث کیا کرتے ہیں اور میں نہیں کرتا، لہٰذا ممکن ہے کہ ان کی احادیث زائد ہو جائیں، البتہ ان کے علاوہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں میرے پاس سب سے زیادہ روایت ہے۔

(۲) اور اگر استثناء کو متصل مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ واقعۃً ان کے پاس مجھ سے زائد احادیث ہیں مگر اس وضاحت کے بعد سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر ان کی مرویات کم کیوں ملتی ہیں؟

تو ان کی مرویات کے کم منقول ہونے کی یہ وجہ ذکر کی جاتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ مرکزِ علم میں رہے اور اہل علم تلاشِ علم میں مدینہ منورہ آتے رہے اس لئے ان کی مرویات پھیلتی رہیں جبکہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا قیام مصر، طائف، شام میں رہا، جہاں طالبان علم حدیث کی آمد اس دور میں کم تھی نیز ان کا اشتغال بالعبادۃ تعلیمی مشغولیت کے مقابلہ میں زیادہ تھا اس بنا پر ان کی مرویات نہ پھیل سکیں۔

حافظ ابن حجر نے ایک وجہ اور لکھی ہے کہ فتح شام کے موقعہ پر ان کو اہل کتاب کے کچھ صحائف مل گئے تھے جن کا وہ مطالعہ کرتے اور کچھ مضامین بھی لکھ لیتے تھے، ان کے اس طرز عمل پر بہت سے تابعین نے ان سے احادیث اخذ کرنا چھوڑ دیا بہر حال صحیفہ صادقہ ان کے انتقال کے بعد ان کے پڑپوتے حضرت عمرو بن شعیب کے پاس منتقل ہوا جس کی

سند بہت ہی مشہور اور قدرے مشکل ہے، ان کے پڑپوتے عام طور پر عن أبیہ عن جدہ کے ذریعہ نقل کرتے ہیں، حافظ ابن حجر نے امام یحییٰ بن معین، علی بن مدینی کا قول نقل کیا ہے کہ جو حدیث بھی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے آئے، تو سمجھنا چاہئے کہ صحیفۂ صادقہ سے ہے۔'' م(۱)

(۲) امام حاکم نے مستدرک میں، اور علامہ ابن عبدالبر نے حضرت حسن بن عمرو کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث بیان کی، تو انہوں نے ناواقفیت ظاہر کی میں نے کہا کہ یہ حدیث تو میں نے ہی آپ سے سنی ہے اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان فرمایا کہ اگر میں نے بیان کی ہوگی تو میرے پاس لکھی ہوگی چنانچہ اندر جا کر وہ صحیفے لائے، جن میں احادیث درج تھیں تلاش کے بعد وہ حدیث مل گئی۔

یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بخاری شریف کی روایت ابھی گذری جس سے معلوم ہوا کہ وہ حدیث نہیں لکھتے تھے، جبکہ یہاں لکھنے کا تذکرہ ہے۔

علامہ ابن عبدالبر نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بخاری شریف کی روایت جس کے راوی ہمام ہیں، وہ اصح ہیں جبکہ مذکورہ روایت ضعیف ہے لہٰذا یہ روایت متروک ہوگی۔

دوسرا جواب: یہاں دفع تعارض ممکن ہے بایں طور کہ حضور کے زمانہ میں نہ لکھتے تھے بعد میں جب خیال پیدا ہوا کہیں نسیان طاری ہو جائے، اور بھول جاؤں تو آخر عمر میں لکھ لیا تھا۔(۲)

تیسرا جواب: حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بخاری کی روایت سے جب معلوم ہوا کہ نہیں لکھتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود نہیں لکھتے تھے اور جہاں مکتوب صحیفہ کا تذکرہ ہے تو وہ کسی نے لکھ دیا ہوگا۔

(۳) حضرت انس بن مالک جن کو دس سال تک خدمت رسول کا زریں موقعہ

---

(۱) فتح الباری (۲) جامع بیان العلم

ملا، انہوں نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تحریر کر لی تھیں آپ کے ایک شاگرد حضرت سعید بن ہلال کہتے ہیں کہ جب ہم حضرت انس بن مالک سے بہت اصرار کرتے تو آپ ہمارے پاس تحریری صحیفے لاتے اور فرماتے یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا ہے اور پھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تصدیق کے لئے پیش بھی کر چکا ہوں۔(۱)

(۴) یہ بات تو بہت معروف و مشہور ہے کہ حضرت علی کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا، حضرت امام بخاری نے کچھ مقامات پر اس مسودہ کا ذکر کیا ہے ان تمام مقامات کے مجموعی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے وہ مسودہ ضخیم تھا، اس میں قصاص، دیت، فدیہ، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق اور وراثت کے کچھ مخصوص مسائل اور اونٹ پر زکوٰۃ کے چند مسائل مندرج تھے۔(۲)

غرض دور صحابہ میں جمع احادیث کی کاوشیں ہوئی ہیں صحبت نبوی سے براہ راست فیض یافتہ اسرار شریعت کے سمجھنے والے صحابہ کرام کیف ما اتفق احادیث لکھ لیا کرتے تھے، بطور مثال چند کا ذکر کیا گیا ورنہ تو اور بھی صحابہ کے اسماء گرامی اس فہرست میں شامل ہیں۔

---

(۱) مستدرک حاکم ذکر انس (۲) بخاری شریف ص ۲۱/۱

دور تابعین میں

''تابعین کا جم غفیر صحابۂ کرامؓ کا شاگرد بنا، اور علم حدیث کے لئے ان کے سامنے مدت دراز صرف کر دی اور ان سے حاصل کردہ روایتوں کو قلم بند کرنا شروع کیا حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگردوں نے اس کا خاص اہتمام کیا تھا، ان میں ایک حضرت بشیر بن نہیک ہیں اور ایک حضرت ہمام بن منبہ ہیں۔

حاجی خلیفہ نے ان کے صحیفہ کا نام'' الصحيفة الصحيحة '' ذکر کیا ہے، حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے ان کی پوری روایات اپنی مسند میں نقل کی ہے (۱) حضرت امام مسلمؒ نے اس صحیفہ سے چند احادیث نقل کی ہے چنانچہ اس کی جب کوئی روایت نقل کرتے ہیں تو فرماتے ہیں:

"عن همام بن منبه، قال هذا ما حدثناه به أبو هريرة عن رسول اللّٰه ﷺ فذكر أحاديث منها وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم " (۲)

حضرت بشیر بن نہیک کے متعلق امام دارمی نے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں جو کچھ حضرت ابو ہریرہ سے سنتا تھا اسے لکھ لیتا تھا، ایک دفعہ میں نے ان کی خدمت میں وہ مجموعہ پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے آپ سے سنی ہیں تو حضرت ابو ہریرہ نے اسکی تصدیق فرمائی۔

عہد تابعین کے مشہور خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ احادیث نبویہ جو صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ ہیں اور جن کو صحابہ نے گراں قدر سرمایہ سمجھ کر اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھا ہے ظاہر ہے کہ ان کی رحلت کے بعد وہ احادیث بھی ان

(۱) مسند امام احمد (۲) مسلم ص ۱۲۴/۱

کے ساتھ مدفون ہو جائیں گی اس لئے انہوں نے ۹۹ھ میں اپنے وزیر مملکت گورنر کے نام فرامین جاری کئے کہ احادیثِ رسول کو جمع کیا جائے اس سلسلہ میں بخاری شریف میں ان کا ایک خط ان الفاظ میں منقول ہے، ''اُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ فَإِنِّيْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ"۔(۱)

''موطأ امام مالک میں سنت رسول کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کو بھی جمع کرنے کا حکم ہے حافظ ابونعیم اصفہانی نے تاریخ (اصفہانی) میں لکھا ہے: "كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ إِلَى الْآفَاقِ اُنْظُرُوْا حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجْمَعُوْهُ"۔

ان خطوط پر پہلی صدی کے اختتام پر اس وقت کے حاملین احادیث اور محدثین نے احادیث جمع کیا ان جمع کرنے والوں میں دو نام زیادہ معروف ومشہور ہیں ایک ابن شہاب زہری کا، جن کا پورا نام محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب زہری ہے، اور یہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت سہل بن سعد، اور حضرت انس بن مالک کے شاگرد ہیں، اور خود ان کے شاگردوں میں حضرت معمر، اوزاعی، لیث اور حضرت امام مالکؒ کا اسم گرامی شامل ہے، ان کی ولادت ۵۰ھ میں، اور وفات ۱۲۵ھ میں ہوئی۔

علامہ ابن عبدالبر نے امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہمیں حضرت عمر بن عبد العزیز نے تدوین حدیث کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، پھر حضرت عمر نے مملکت کے ہر خطے میں ان دفاتر میں سے ایک دفتر بھیج دیا۔

دوسرا مشہور نام حضرت ابوبکر ابن حزم کا ہے یہ ابن شہاب کے ہمعصر ہیں، اور مدینہ منورہ کے گورنر تھے، انہوں نے بھی حدیث کی کئی کتابیں لکھیں لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس نہ پہونچا سکے کہ حضرت عمر کا ۱۰۱ھ میں انتقال ہو گیا۔'' م

(۱) بخاری شریف ص ۲۰

مدونِ اوّل کون؟

اب یہاں یہ بات اختلافی بن گئی کہ ان دونوں میں مدون اول کون ہیں؟ اکثر حضرات محدثین کا میلان ابن شہاب زہری کی طرف ہے، مثلاً حضرت امام مالکؒ، ابن حجرؒ، علامہ سیوطی وغیرہ، تاہم امام بخاری کی رائے ابوبکر بن حزم کی طرف ہے، لیکن ابھی ابن عبدالبر کے حوالہ سے امام زہری کا جو قول نقل کیا گیا ہے کہ ہم نے مجموعہ بھیج دیا اور انہوں نے ہر خطہ میں ارسال فرمایا تو اس سے جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ ابن شہاب مدوّن اوّل ہیں۔

بعض کتابوں میں دیگر محدثین کو بھی مدون اوّل قرار دیا گیا ہے، علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ درحقیقت یہ اختلافِ اقوال حیثیت کے اعتبار سے ہے یعنی ہر ایک کو مدونِ اول کہہ سکتے ہیں تاہم اعتباری فرق کے ساتھ کہ کوئی تو مطلقاً جمع حدیث میں اولیت کی شان رکھتا تو کوئی ابواب کی ترتیب کے ساتھ جمع کرنے میں اول ہے تو کوئی مراتب صحابہ کے اعتبار سے جمع کرنے میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے اسی کو انہوں نے اپنے اشعار میں جمع کیا ہے۔

أَوَّلُ جَامِعِ الْحَدِيْثِ وَالْأَثَرْ
اِبْنُ شِهَابٍ آمَرَ لَهُ عُمَرْ
وَ أَوَّلُ الْجَوَامِعِ لِلْأَبْوَابِ
جَمَاعَةٌ فِيْ الْعَصْرِ اِقْتَرَبْ

(ألفيه سيوطي)

دوسری صدی

پہلی صدی میں تدوین حدیث کا جو کام ہوا وہ کیف ما اتفق تھا، عام طور پر وہ صحیفے موضوعاتی ترتیب پر نہ تھے، لیکن جب دوسری صدی کا آغاز ہوا، تو اس میں مزید پیش رفت ہوئی، اور بہت ہی اہتمام کے ساتھ یہ کام ہوا اس صدی میں ترتیب شدہ کتب حدیث کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد موضوعات کے لحاظ سے مرتب ہوئیں، ہاں بعض ایسی بھی ہوئی جو بغیر موضوع کے مرتب ہوئی، لیکن قدرے مشترک ہر ایک میں یہ بات ضرور تھی کہ اس میں صرف صحیح احادیث نہ تھیں بلکہ صحابہ کے اقوال وفتاویٰ بھی مخلوط کر دیئے گئے۔

اس صدی میں مدون ہونے والی کتب حدیث کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان میں سے اب اکثر اس لئے نہیں پائی جاتیں کہ ان میں کی اکثر و بیشتر بعد میں مرتب ہونے والی بڑی ضخیم کتب حدیث میں شامل ہو گئیں، اور وہ ضخیم کتب حدیث تفصیلی اور مبنی بر ضرورت ہونے کی بنا پر اس طرح وسیع پیمانے پر مقبول عام ہوئیں کہ ان حضرات کی کاوشیں منظر عام پر نہ آسکیں، ان میں بعض جو مطبوعہ ہیں ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) كتاب الآثار لأبي حنيفة :

سب سے پہلی دفعہ امام ابوحنیفہؒ نے چالیس ہزار احادیث میں سے منتخب کر کے یہ کتاب فقہی ترتیب پر مرتب کی یہ کتاب موطا امام مالک سے مقدم ہے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حضرت امام مالک نے حضرت امام صاحب کی تالیف سے استفادہ کیا ہے، حافظ ذہبی نے مناقب میں قاضی ابوالعباس محمد بن عبداللہ بن ابی العوام کی " أخبار أبي حنيفه " کے حوالہ سے سند متصل کے ساتھ مشہور محدث عبدالعزیز دراوردی کا یہ قول نقل کیا ہے "كان مَالِكٌ يَنْظُرُ فِيْ كُتُبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَيَنْتَفِعُ بِهَا".

علامہ سیوطیؒ نے تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کی یہ فضیلت کچھ کم نہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے ابواب فقہیہ پر مرتب کتاب تالیف کی، یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہ ہوسکی۔

(۲) موطأ إمام مالك :جب یہ تالیف ہوئی تو اس کو "أصح الكتب بعد كتاب الله" کہا جانے لگا اس کے بعد بخاری شریف کو یہ خطاب ملا۔

(۳) مصنف ابن عبد الرزاق: گیارہ جلدوں میں شیخ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی تحقیق کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

(۴) كتاب الزهد و الرقاق: خراسان میں حضرت عبداللہ بن مبارک نے لکھی، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۵) كتاب الأم للشافعي : محدثین اس کو حدیث کی کتابوں میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ امام شافعیؒ نے اس کو فقہ شافعی کے مسائل اور اس مستدلات کے طور پر قلمبند فرمایا تھا۔

(۶) السنن لابن جريج : یہ سب سے پہلے مکہ میں مرتب ہوئی۔

(۷) مسند ربيع بن صبيح : حضرت ربیع بن صبیح نے بصرہ میں سب سے پہلے مسند لکھی جن کا مزار بھروچ شہر سے ۱۲/ کیلومیٹر دور بھار بھوت مقام پر ہے۔

(۸) جامع سفيان ثوري: کوفہ میں سب سے پہلے یہ مرتب ہوئی۔

"تسلسل کے ساتھ کام ہوتا رہا اور مختلف مدارج طے کرتا ہوا اب موجودہ شکل میں آیا۔"

تیسری صدی

غرض دوسری صدی کے محدثین کی یہ وہ کاوشیں ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کا کام تیسری صدی میں نہیں بلکہ پہلی اور دوسری صدی میں شروع ہو چکا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ رسالت کے بعد ہر دور میں تدوین حدیث اس صدی میں اپنے شباب اور عروج کو پہونچی حدیث کی سندیں طویل ہوئیں، کئی کئی سندوں سے روایت نقل ہونے لگی، اور نئی نئی ترتیب اور نہج پر کتب حدیث مرتب ہونے لگیں، اسی دور کی کاوشیں" صحاح ستہ، مصنف ابن أبي شيبة، المستدرك للحاكم، المعجم للطبراني، سنن دار قطني "وغیرہ قابل ذکر ہیں:

مذکورہ کتب حدیث میں نمایاں اسلوب سب سے پہلے امام بخاری نے اختیار کیا، ذخیرہ احادیث سے صرف ان احادیث کا انتخاب کیا جو محدثین کی اصطلاح میں صحیح ہوں، جبکہ اس سے پہلے کی کتب، صحیح اور غیر صحیح کا مجموعہ تھیں بغیر علم رواۃ کے اندازہ لگانا مشکل تھا، اگر رواۃ کا علم نہ ہوتا تو اپنے اساتذہ سے رجوع کرتے اور جس کو یہ بھی میسر نہ ہوتا تو وہ مجہول الحال روایت سمجھی جاتی لیکن امام بخاری نے امت کو سب سے پہلے اس الجھن سے نجات دی ان کے بعد امام مسلم نے اس اسلوب کو اختیار فرمایا۔

غرض تدوین حدیث کے مختلف ادوار ہوئے پہلا دور تدوین علی الاطلاق رہا، جس میں بلا کسی خاص ترتیب و مضمون کے ہر نوع کی حدیثیں نقل کی گئیں، یہ پہلی اور دوسری صدی کے اوائل میں پیش آیا۔

دوسرا دور تدوین علی الابواب کا ہے یعنی احادیث کے مخلوط ذخیروں میں سے ہر مضمون کی حدیثیں الگ الگ منتخب کر کے علیحدہ علیحدہ باب میں ترتیب دی گئیں جیسا کہ

دوسری صدی کے وسط میں یہ کام ہوا۔

تیسرا دور تدوین علی الصحاح کا ہے جس میں صرف احادیث صحیحہ کو سقیمہ سے الگ کر کے لکھا گیا یہ تیسری صدی کے اوائل میں پیش آیا۔

حفاظت حدیث کے اسباب:

جس طرح کلام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود باری تعالیٰ نے لی ہے اور اعلان فرمایا ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ﴾ اسی طرح حق تعالیٰ نے حدیث نبوی کی حفاظت کا انتظام فرمایا، کیونکہ معانی قرآن کا دوسرا نام حدیث ہے، الفاظ قرآنی کی حفاظت کے ساتھ معانی قرآن کو محفوظ نہ کیا جاتا تو نفس قرآن سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس لئے اس کی بھی حفاظت کے انتظام فرمائے، خدا نے حفاظت حدیث کے لئے جو اسباب پیدا فرمائے ان کی بنیاد صرف دو ہے:

(۱) خدا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں کشش و جاذبیت کے اس قدر جوہر ودیعت کر دیئے کہ آپ صحابہ کی نگاہ میں دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب ہو گئے اور آپ کی بات دنیا کی بہترین اور قیمتی نعمت بن گئی۔

نیز آپ کی ایسی امتیازی شان کہ خدا نے ہر لحاظ سے بلند و بالا، اور اشرف و کامل بنایا، حتی کہ خاندانی اور سماجی اعتبار سے بھی مکرم و معزز بنایا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت ابو عبیدہ کو حضرت انس کے ذریعہ ایک موئے مبارک ہاتھ آ گیا، تو فرمانے لگے "لَأَنْ تَكُوْنَ عِنْدِيْ شَعْرَةٌ مِنْهَا أَحَبَّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا". آپ کے جسم اطہر سے جو پسینہ نکلتا تھا اس میں عطر کی خوشبو محسوس ہوتی، ایک صحابیہ رسول آپ کے پسینۂ مبارک کو جمع کر رہی تھیں، آپ کے پوچھنے پر انہوں نے عرض کیا کہ مدینہ کی خوشبو میں آپ کے پسینہ مبارک کو ملا دیتی ہوں، تو وہ عطر تمام عطروں سے زیادہ عمدہ اور

نفیس ہو جاتا ہے، صحابۂ کرام کا بیان ہے کہ جس گلی سے آپ کا گذر ہوتا، وہ خوشبو سے مہکنے لگتی۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بلغم تھوکتے تھے تو صحابہ کرام کی محبت وعشق کا اندازہ لگایئے کہ زمین پر اس کو گرنے نہیں دیتے بلکہ اپنے چہرے اور ہاتھ پر مل لیتے تھے، جب وضو فرماتے تو جسم اطہر سے گرنے والے پانی کے لئے صحابہ ایک دوسرے سے سبقت کرتے۔

صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ آپ کا لعاب اور غسالہ تک اپنے جسم پر مل لیتے تھے۔

غرض جس جماعت کو اپنے محبوب کی ذات اقدس اور ان کے لعاب وبال وغیرہ سے اتنی محبت اور عقیدت ہو ان کو آپ کے کلام مبارک سے کتنی محبت وعقیدت ہوگی؟ جب صحابہ نے ذات اقدس کی حفاظت کی تو خدا نے ان کے قلوب کو محبت سے اس قدر لبریز کر دیا کہ کلام رسول کی حفاظت میں مشغول ومنہمک بلکہ مجبور ہو گئے۔

اور پھر کلام رسول سے کس درجہ عشق ہوا، اسکا اندازہ ان واقعات سے لگایئے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر حضرت عائشہ سے احادیث سن کر قلمبند کر لیا کرتے تھے واقعہ حرہ میں ان سے وہ مجموعہ گم ہو گیا تو حیرت و افسوس میں کہا کرتے ''لَوَدِدْتُ أَنِّي قَدْ فَدَيْتُهَا بِأَهْلِي وَ مَالِي''، یعنی کاش میں اہل و عیال دیکر اس مجموعہ کو بچا لیتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ اپنی زندگی طلب حدیث میں وقف کر چکے تھے، اور طلب حدیث کے درمیان ان پر کیا کیا گذری؟ ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، ''وَ اللّٰهِ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِنْ كُنْتُ لَأَعْتَمِدُ عَلَى الْأَرْضِ بِكَبِدِي مِنَ الْجُوعِ وَ أَشُدُّ الْحَجَرَ عَلٰى بَطْنِي''. خدا کی قسم میں بھوک کی وجہ سے جگر تھام کر زمین پر میں ٹیک لگا لیتا اور بھاری پتھر اپنے شکم پر باندھ لیتا، کبھی فرماتے کہ منبر رسول اور حجرہ حضرت عائشہ کے درمیان چکرا کر گر جاتا، لوگ یوں سمجھتے کہ میں پاگل ہو گیا ہوں حالانکہ جنون سے مجھے کیا تعلق؟ وہ تو صرف بھوک کا اثر

ہوتا، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ جن کا مکان مدینہ منورہ میں تھا فرماتے ہیں کہ کسی (صحابی رسول) کے واسطے سے مجھے ایک حدیث پہونچی، میں نے سوچا کہ براہ راست وہ حدیث ان سے سنوں، چنانچہ میں نے ایک اونٹ خریدا اور ایک ماہ مسلسل سفر کرتا ہوا ملک شام پہونچا وہاں حضرت عبداللہ بن انیس انصاری کے گھر پہونچ کر ایک آدمی کو بھیجا کہ ان سے کہو دروازہ پر ایک مسافر کھڑا ہے، انہوں نے اندر سے پوچھا کہ کیا جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں! وہ باہر نکلے دونوں ایک دوسرے سے گلے لگے، اسکے بعد میں نے کہا کہ آپ کے واسطے سے مجھے ایک حدیث پہونچی ہے میں آپ سے براہ راست سننے آیا ہوں، انہوں نے پوری حدیث سنادی، سننے کے بعد یہ فوراً واپس لوٹ آئے اس سے اندازہ لگایئے کہ حدیث رسول سے کس قدر عشق و محبت تھی کہ طویل مسافت طے کرنا آسان تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ کبھی زبان پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آجاتا تو "ارتَعَدَ وارتَعَدَت ثیابُہُ تَنضَحَ أوداجُہُ اِغرَورَقَت عَیناہُ" یعنی کانپنے لگتے، کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی، گردن کی رگیں پھول جاتی، اور آنکھیں آنسو سے بھر جاتیں۔ (مستدرک حاکم) حضرت ابوذر کبھی حدیث بیان کرتے ہوئے "أوصانی حبی أبو القاسم، أوصانی خلیلی" جیسے الفاظ کہتے اور چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے۔

ان واقعات کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محبت و عقیدت، اور عظمت و ہیبت کس قدر غالب تھی اور ان کے کلام کو یاد رکھنے اور بھولے ہوئے کو محفوظ کرنے کا کتنا شوق ان کے قلوب میں موجزن تھا، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس نے کلام رسول کو ان ہی کے الفاظ میں محفوظ رکھا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھئے کہ جس قرآن نے اقوال و افعال کی اطاعت و اتباع کو ضروری قرار دیا تھا اسی قرآن نے اس کا بھی پابند بنا دیا تھا کہ زبان

رسالت سے جو کچھ سنو یا جو کچھ انہوں نے کیا اسے مسلسل پہونچاتے چلے جاؤ، بلکہ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلے کو پیغام پہنچاتا رہے، میدان منی میں ایک لاکھ سے زائد پروانۂ رسول کا مجمع ہے آپ نے درمیان خطاب فرمایا: "نَضَّرَ اللّٰهُ امرءاً سَمِعَ مَقَالَتِيْ شَيْئًا فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَهٗ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعىٰ لَهٗ مِنْ سَامِعٍ" پھر فرمایا: "أَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" بلکہ باہر سے آنے والے وفود کو حکم ہوا، "اِحْفَظُوْهُنَّ وَأَخْبِرُوْهُنَّ مَنْ وَّرَائَكُمْ" اور حدیث پاک "مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهٗ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ" میں بھی اسی حفظ واشاعت کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ احادیث رسول کے یاد رکھنے اور پہونچانے میں محتاط رہنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور ان کی فطرت میں مشہور حدیث "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ" کے تہدیدی خوف کو اس طرح رائج کیا گیا، کہ جتنے صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند احادیث کے سوا اس قدر کثیر تعداد میں صحابہ سے منقول ہو کہ روایت کے یاد رکھنے کی پوری فکر ہو اور سناتے وقت ذمہ داری کا احساس ہو۔

حفاظت حدیث کا دوسرا سبب حفظ احادیث ہے، یہ طریقہ اس دور کے لحاظ سے بہت ہی قابل اعتماد ذریعہ تھا، حق تعالیٰ نے جن صحابہ سے حفظ حدیث کا کام لیا ان کو غیر معمولی قوت حافظہ عطا فرمایا، بلکہ عمومی طور پر مؤرخین لکھتے ہیں:

"مَذْهَبُ الْعَرَبِ أَنَّهُمْ كَانُوْا مَطْبُوْعِيْنَ عَلَى الْحِفْظِ مَخْصُوْصِيْنَ بِذٰلِكَ".

یعنی عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنا ان کی فطرت جیسی تھی۔

ایک مجلس میں صحابہ کرام تشریف فرما تھے ایک شاعر آیا اور کچھ اشعار پڑھ کر سنایا، اور پھر فوراً روانہ بھی ہو گیا، حضرت ابن عباسؓ نے حاضرین سے پوچھا کہ فلاں مصرعہ شاعر نے کس طرح پڑھا؟ حاضرین نے کہا آپ صرف ایک شعر اس طرح پوچھتے ہیں جیسے بقیہ

اشعار آپ کو یاد ہو چکے ہوں، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ پھر پورا قصیدہ سنا دیا۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ عبدالملک بن مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ کے حافظہ کا امتحان لینا چاہا، انہیں بلا کر احادیث بیان کرنے کی درخواست کی، ادھر ایک کاتب کو بٹھا دیا کہ ان کی احادیث لکھتے رہو، حضرت ابو ہریرہؓ نے بہت سی احادیث سنائیں اور تشریف لے گئے اگلے سال عبدالملک ابن مروان نے ان کو دوبارہ بلوا کر کہا کہ جو حدیث آپ نے سال گذشتہ سنائی تھی امسال بھی سنایئے، انہوں نے سنانا شروع کیا وہ کاتب کاپی سے ملاتا رہا، کسی جگہ ایک حرف، ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں ہوا بلکہ حسب سابق اسی ترتیب کے ساتھ سنایا، جب حضرت ابو ہریرہؓ تشریف لے گئے تو عبدالملک کے پوچھنے پر کاتب نے کہا ''مَا غَادَرَ حَرْفاً'' یعنی اتنے عرصہ کے بعد بھی سنانے میں ایک حرف کا بھی کوئی فرق نہیں پڑا، اس طرح کے واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان حضرات کو غیر معمولی حافظے من جانب اللہ اسی لئے عطا ہوئے تھے تا کہ ان سے حفاظت حدیث کا عظیم کام لیا جا سکے۔

تابعین میں حفظ حدیث کا جذبہ

گذشتہ واقعات تو ان ستودہ صفات کے تھے جنہوں نے براہ راست نور نبوت سے استفادہ کیا تھا، لیکن جنہوں نے اپنی نگاہوں سے آپ کو نہیں دیکھا ان کے ذوق وشوق اور کلام رسول سے عشق کے واقعات تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں (۱) ابن سعد نے دمشق کے محدث عبدالرحمٰن ابن میسرہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خواب میں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو انہوں نے موقعہ کو غنیمت جان کر سرکار دوعالم ﷺ سے دعا کی درخواست کی "یَا نَبِیَّ اللّٰہِ اُدْعُ اللّٰہَ لِیْ اَنْ اَکُوْنَ عُقُوْلاً لِلْحَدِیْثِ وِعَاءً لَہٗ" اس سے حفظ حدیث کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے کہ خواب میں بھی حفظ حدیث کا شوق مسلط ہے۔ (۲) ابوحاتم رازی نے جو علل کے امام ہیں لکھا ہے کہ یہ کم عمری ہی میں طلب حدیث کے لیے وطن سے نکل پڑے اور لمبی مدت سفر میں رہے، علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا قول نقل کیا ہے "أَوَّلُ مَا رَحَلْتُ أَقَمْتُ سَبْعَ سِنِیْنَ" یعنی پہلی بار جب گھر سے نکلا تو سات سال تک سفر میں رہا، خود ان کا بیان منقول ہے کہ شروع میں اس کا خیال رکھا کہ کتنے میل طے ہوئے تین ہزار میل تو میں گنتا رہا، لیکن پھر گننا چھوڑ دیا، تاہم اطلس اٹھا کر دیکھا جاسکتا ہے کہ کتنا لمبا سفر انہوں نے کیا، جبکہ خود ان کا بیان ہے کہ "خَرَجْتُ مِنَ الْبَحْرَیْنِ إِلٰی مِصْرَ مَاشِیًا ثُمَّ إِلٰی رَمْلَۃَ، ثُمَّ إِلٰی طُرْطُوْسَ وَلِیْ عِشْرُوْنَ سَنَۃً" بحرین سے مصر، پھر رملہ، طرطوس تک پیدل سفر کیا اور اس وقت میری عمر بیس سال تھی، علم حدیث کی حفاظت کے پیش نظر دشوار گزار راستوں کو طے کرنا کتنا مشکل ہوگا جبکہ موجودہ دور کی سہولتوں کا نام ونشان نہ تھا، لیکن یہ سب طلب حدیث کے جذبہ نے

ان کے لئے آسان کر دیا تھا۔

مشہور محدث حضرت امام مالک کے استاد حضرت ربیعۃ الرائے کا یہ حال تھا کہ علم حدیث کی تلاش میں گھر کی چھت اور کڑیاں تک بیچ دیں اور یہ حال بھی ہوا کہ گرے پڑے کھجور چن کر کھانے کی نوبت آئی، اس طرح امام ابو یوسف نے علم حدیث کے شوق میں گھر کی کڑی تک فروخت کر ڈالی۔

فن رجال کے امام یحییٰ بن معین کے والد دس لاکھ پچاس ہزار درہم چھوڑ کر وفات پائے، لیکن اتنی بڑی دولت کیا ہوئی؟ خطیب بغدادی لکھتے ہیں" فَأَنْفَقَهُ كُلَّهُ عَلَى الْحَدِيْثِ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ لَهُ نَعْلٌ يَلْبَسُهُ".

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بڑی تنگی میں علم حدیث حاصل کیا، یمن اپنے استاد عبدالرزاق کی خدمت میں پہونچے وہاں ازار بند بن بن کر اپنی ضرورت پوری کرتے، جب علم حدیث حاصل کر لیا تو نانبائی کے کچھ روپے باقی رہ گئے تھے تو جو جوتا پہنے ہوئے تھے وہی اس کو دے دیا اور پیدل روانہ ہو گئے راستے میں بھی مزدوری کرتے اور زاد راہ حاصل کرتے، مذکورہ سارے واقعات تاریخ دمشق میں موجود ہیں ان کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ خداوند قدوس نے تابعین اور تبع تابعین کے دل میں علم حدیث کا ایسا شوق و جذبہ ڈال دیا تھا کہ ہر طرح کی دشواریوں کو جھیلنا آسان ہو چکا تھا۔

(نوٹ) یہ ساری تفصیلات تدوین حدیث، نفع المسلم شرح صحیح المسلم سے ماخوذ ہیں۔

حدیث کی اہمیت:

ہر دور میں علماء ربانیین نے فن حدیث کو تفسیر سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فن حدیث درحقیقت قرآن کی تفسیر اور فقہ کا متن ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ اس لئے حدیث کے بغیر نہ تو قرآن حل ہو سکتا ہے اور نہ ذخیرۂ فقہ تیار ہو سکتا ہے، حدیث کی خدمت درحقیقت قرآن فہمی اور فقہ سازی کی

خدمت ہے، حدیث اگر کتاب اللہ کے اجمال کی تفصیل ہے تو فقہ حدیث کے اجمال کی تفصیل ہے، اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ کتاب اللہ اصل اور جڑ ہے اور تنا جس پر درخت کھڑا ہے وہ حدیث ہے اور پھول پتیوں کا پھیلاؤ فقہ ہے گویا فقہ حدیث کا نتیجہ اور قرآن کا ثمرہ ہے یہ ثمرہ حدیث کے واسطے کے بغیر وجود میں آنا ناممکن تھا تو جس طرح اللہ اور بندوں کے درمیان رسول واسطہ ہیں کہ ان کے بغیر بندہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح کلام خدا اور کلام مجتہدین کے درمیان کلام رسول واسطہ ہے، حدیث کے بغیر مجتہدین کے کلام کو خدا سے کوئی سند نہیں مل سکتی، اور جو طبقہ بھی حدیث کو ترک کرے گا نہ وہ قرآن تک پہونچ سکے گا اور نہ فقہ تک، اسکے پاس دین کی کوئی بھی اصل اور حجت باقی نہ رہ سکے گی، وہ بندۂ حق ہونے کے بجائے بندۂ نفس ہوگا۔

کیونکہ ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ کی عملی تعبیر ذخیرۂ حدیث ہے کہ جس طرح حفاظت قرآن کی ذمہ داری خود اللہ نے لی اس کے معانی ومراد کی وضاحت بھی اپنے ذمہ لی، یہی معانی ومراد جو زبان نبوت سے نکلی احادیث کہلائی، تو جس طرح متن کو بغیر شرح کے حل کرنا دشوار ہوتا ہے قرآن بھی بغیر حدیث سمجھنا ناممکن ہے، اگر حدیث کو قرآن سے خارج کر دیا جائے تو ذخیرۂ فقہ ایسا ہی بے تعلق ہو جائے گا جیسے کہ درخت سے تنا کو جدا کر دینے کے بعد شاخ اور پھل پھول جڑ سے بے تعلق ہو جاتے ہیں اور جس طرح شاخ، پتیاں اور تنا، جڑ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی طرح حدیث وقرآن اور فقہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم، اور ایک کو ماننا دوسرے کے ماننے کو مستلزم ہے۔

حجیتِ حدیث

بلاشبہ قرآن پاک دین وشریعت کی اصل واساس ہے اور ادلہ شرع میں وہی سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے، مگر اس کا کام صرف اصول بتانا ہے، تفریع وتفصیل اور توضیح وتشریح حدیث وسنت کا وظیفہ ہے۔

ہر باخبر جانتا ہے کہ قرآن کریم امت کو بلا واسطہ رسول نہیں دیا گیا تھا کہ لو تم بذاتِ خود یا اپنے ہی جیسے غیر نبی لوگوں کی مدد سے پڑھو اور سمجھو اور اس پر عمل کرو، بلکہ اس کے نزول سے پہلے ایک برگزیدہ رسول کو دنیا میں بھیج کر ان پر قرآن نازل کیا گیا اور یہ صرف اس لئے کیا گیا تا کہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ صرف رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں اللہ کی اس کتاب کو سمجھیں، چنانچہ قرآن پاک ہی میں ارشاد ہوا:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل: ع٦)

اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر وکتاب کو تا کہ آپ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی ان کی طرف اور تا کہ وہ غور وفکر کریں۔

اور پھر قرآن ہی کے ذریعہ رسول کے فرائض اور ان کے منصب سے دنیا والوں کو آگاہ کیا گیا اور بار بار اعلان کیا گیا کہ یہی تم کو قرآن کے کلمات وحروف سنائیں اور یاد کرائیں گے اور یہی تم کو اس کے معانی ومطالب اور رموز وحکم بھی بتائیں گے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْ عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ: ع١٨)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں، اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب وحکمت، اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوْا مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.﴾

(آل عمران: ع ۱۷)

بہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب کہ بھیجا ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ تلاوت کرتا ہے ان پر اُس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے ان کو کتاب وحکمت کی اور بالیقین تھے وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔

تیسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.﴾ (جمعہ: ع ۱)

وہی وہ ذات ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں سے کہ تلاوت کرتا ہے اُن پر اُس کی آیتیں اور اُن کو پاک کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی اُن کو تعلیم دیتا ہے وہ تھے اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔

ان تینوں آیتوں میں دو چیزیں الگ الگ ذکر کی گئی ہیں:

(۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب

پہلی چیز یعنی تلاوت آیات کا مطلب تو ظاہر ہے، ہاں تعلیم کتاب کی نسبت غور

کرنا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ اگر اس کی مراد بھی قرآن پاک کے مربوط و مرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی ہے تو یہ تلاوت آیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہوئی، حالاں کہ وہ اس سے الگ ذکر کی گئی ہے، پس یقیناً اس سے مراد آیات کی تشریح اس کے معانی و مطالب کی توضیح اور آیات کے حکم اور احکام کا بیان ہے۔

پس جب قرآن ہی سے یہ معلوم ہو چکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت میں جس طرح الفاظ و کلمات قرآن کی تلاوت و تبلیغ ہے اسی طرح اُس کے معانی و مطالب کا بیان بھی فرائض رسالت میں داخل ہے تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح متن قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریحات بھی حجت اور واجب القبول ہیں، ورنہ آپ کو تعلیم کا مکلف بنانا اور تعلیم کتاب کو آپ کا منصبی وظیفہ بتلانا بالکل بے معنی ہوگا، الغرض ان قرآنی نصوص کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیغام رساں ہونے کے ساتھ اس پیغام کے معلم اور مبین بھی ہیں۔

اور جب قرآنی نصوص سے آپ کا معلم و مبین قرآن ہونا ثابت ہو چکا تو جو شخص آپ کی رسالت و نبوت پر ایمان رکھتا ہے جس طرح اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے متن قرآن کی تلاوت و تبلیغ فرمائی اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے اس کی تعلیم و تبیین بھی فرمائی، اور چونکہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری نبی ہیں اور اب کوئی نئی کتاب اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لئے آخری کتاب کا اس کے نزول کے وقت سے رہتی دنیا تک ہر دور میں محفوظ و باقی رہنا ضروری ہے اور جب اس کی بقا ضروری ہے تو اس پر عمل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تشریحات و توضیحات کا بھی ہر دور میں منقول و متداول اور موجود رہنا ضروری ہے۔

اب تک ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) قرآنی نصوص کی رو سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے معلم وشارح ومبین ہیں۔

(۲) آپ نے جس طرح متن قرآن کی تبلیغ کی اسی طرح اس کی شرح وتبیین بھی فرمائی۔

(۳) آپ کی تشریحات وبیانِ قرآن کا قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہنا ضروری ہے۔اس کے آگے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم دوطرح سے دی ہے۔

(۱) آپ نے اپنے فعل وعمل سے بھی اس پر عمل کرنے کی صورت سکھائی اور اس کا مفہوم سمجھایا ہے اور اس کی قولی تشریح بھی فرمائی ہے، عملی تشریح کی صورت یہ تھی کہ قرآن میں ایک حکم نازل ہوا آپ نے اُس حکم پر عمل کر کے لوگوں کو دکھا دیا جس کی وجہ سے الفاظ قرآن کا مفہوم بھی متعین ہو گیا اور جس بات کا حکم ہوا ہے اس کا عملی نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آ گیا، مثلاً قرآن پاک میں اقامت صلوٰۃ کا تاکیدی حکم نازل ہوا، اور اس کے ارکان اور بعض اجزائے ترکیبی (مثلاً قیام، رکوع، سجود، قراءت وغیرہ) کا ذکر بھی قرآن میں کیا گیا مگر ان اجزا کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ ادا کرنے کا بیان اور نماز کی پوری ترکیب اس میں ذکر نہیں کی گئی، پس ان اجزا کو خاص ترکیب کے ساتھ باہم مربوط کر کے نماز قائم کرنے کی ایک خاص شکل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے متعین ہوئی۔

قرآن پاک میں "اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ" کا حکم دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ضروری ہے کہ اس حکم پر عمل کس طرح کیا جائے اور اقامت صلوٰۃ کا کیا طریقہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "صَلُّوۡا کَمَا رَاَیۡتُمُوۡنِیۡ اُصَلِّیۡ" تم جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھو، گویا اس سوال کا جواب ہے۔

نیز حکم "اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ" کی اس عملی تشریح کے علاوہ کبھی کبھی آپ نے اقامت صلوٰۃ کی ترکیب زبانی بھی ارشاد فرمائی ہے۔

اسی طرح مثلاً قرآن پاک میں حج کو فرض قرار دیا گیا مگر حج کا طریقہ اور ترتیب

اوراس کے ارکان ومناسک نہیں بیان کئے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کر کے دکھادیا کہ اس طرح اس فریضہ کی بجا آوری ہونی چاہئے، اوراس لئے کہ قرآن کی تشریح و تبیین صرف آپ ہی کے قول یا عمل سے ہوسکتی ہے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں جہاں سارے حجاج تھے اعلان فرمایا:

"خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ لَعَلِّیْ لَا اَرَاکُمْ بَعْدَ عَامِیْ هٰذَا."

لوگو! تم سب حج کے مناسک مجھ سے سیکھ لو شاید اس سال کے بعد میں تمہیں نہ دیکھوں۔

پھر قولی تشریح کی بھی دوصورتیں تھیں، ایک یہ کہ قرآن پاک کی کسی آیت کا ذکر اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی تفسیر یا اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے اس کو بیان فرماتے تھے، اور دوسری صورت یہ بھی کہ اپنے علم اور فہم مخصوص کی بنا پر جو استنباط واستفادہ آپ نے قرآن کریم سے کیا اس کو آیت کا حوالہ دئے اور اس کی طرف اشارہ کئے بغیر بیان کر دیتے تھے۔

پہلی صورت کی کثیر التعداد مثالوں میں سے صرف تین مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ کو حق تعالیٰ پکارے گا وہ کہیں گے "لبّیك و سعدیك یا رب" خدا پوچھے گا تم نے ہمارا پیغام پہنچادیا تھا؟ وہ جواب دیں گے ہاں! اس کے بعد ان کی امت سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس نوحؑ نے ہمارا پیغام پہونچایا تھا؟ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تب خدائے تعالیٰ حضرت نوحؑ سے مخاطب ہوگا کہ تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت، اس کے بعد امت محمدیہ گواہی دے گی کہ حضرت نوح نے پیغام پہنچادیا تھا، اور امت کی گواہی کی تصدیق رسول کرے گا (یعنی میں کروں گا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد فرمایا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى

النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ میں یہی بیان ہے۔
(صحیح بخاری کتاب التفسیر، بروایت ابوسعید خدری)

(۲) حضرت عدی بن حاتم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا "اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ" اور "اَلْخَيْطُ الْاَسْوَدُ" سے دو دھاگے مراد ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "لَا بَلْ هُوَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَبَيَاضُ النَّهَارِ" (نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے)۔(بخاری کتاب التفسیر)

(۳) حدیبیہ کے سفر میں حضرت کعب بن عجرہ کے سر میں بے انتہا جوئیں پڑ گئیں تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی تکلیف ومشقت میں مبتلا ہو گئے ہو، کیا ایک بکری تم پا سکتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ اچھا سر منڈوا ڈالو، اور تین روزے رکھ لو، یا چھ مسکینوں کو فی مسکین ایک صاع کے حساب سے صدقہ دیدو۔(بخاری کتاب التفسیر)

اس واقعہ میں بظاہر آیت کا حوالہ واشارہ نہیں ہے مگر ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ کا نزول چونکہ اسی واقعہ میں ہوا ہے اس لئے ہم نے اس مثال کو بھی اسی ضمن میں ذکر کیا۔

قرآن پاک کی قولی تشریح کی دوسری صورت میں احادیث نبویہ کا اکثر حصہ یا ان کی بہت بڑی تعداد داخل ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ایسی حدیثوں کا قرآنی ماخذ اپنے علم وعقل کی کوتاہی اور قصور فہم کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ایسی حدیثوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن کا قرآنی ماخذ تھوڑی سی توجہ اور تامل سے سمجھ میں آجاتا ہے، کم از کم دو مثالیں ناظرین اس کی بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے:

"لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ."

تم میں سے کوئی اس وقت تک صاحب ایمان نہ ہوگا جب تک کہ اس کی خواہش اور رجحان اس تعلیم وہدایت کا تابع نہ ہوجائے جس کو میں لایا ہوں۔

اِس کی نسبت بہت آسانی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ارشاد قرآن کی حسب ذیل آیتوں سے مستفاد ہے۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً.﴾ (النساء:ع۹)

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پائیں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْراً اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ.﴾ (احزاب:ع۵)

اور کام نہیں کسی ایمان والے مرد کا اور نہ ایمان والی عورت کا جب کہ فیصلہ کردیں اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا، یہ کہ ان کو رہے اختیار اس معاملہ میں (یعنی اللہ ورسول کے حکم کے بعد ایمان والوں کا کام صرف تعلیم واطاعت ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے)۔

(۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مَنْ مَلَكَ زَاداً وَ رَاحِلَةً تُبَلِّغُهٗ إِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَ لَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا"

جو شخص زاد راہ اور ایسی سواری پائے جو اس کو بیت اللہ تک پہنچا دے پھر بغیر حج کئے مرجائے تو اس پر کچھ مشکل نہیں کہ یہودی ہوکر مر جائے یا نصرانی ہوکر۔

اس کی نسبت خود ترمذی کی روایت میں ارشاد موجود ہے کہ یہ قرآن پاک کی

آیت ﴿وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ الآیۃ﴾ سے مستنبط ہے، مگر روایت میں چونکہ آیت مذکور نہیں ہے اس لئے بہت سے لوگوں کو وجہ استنباط سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے، پوری آیت سامنے ہو تو اس کے آخری حصے سے صاف وہ تہدید مفہوم ہوتی ہے جو حدیث میں مذکور ہے، سنئے پوری آیت یوں ہے:

﴿وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ.﴾ (آل عمران: ع۱۰)

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا بیت اللہ کا اُن پر جو استطاعت رکھتے ہوں اس کی طرف راہ چلنے کی، اور جو کوئی کفر کا طریقہ اختیار کرے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

اس قسم کی اور بھی کثیر التعداد مثالیں پیش ہو سکتی ہیں، مگر اس وقت چونکہ ہمارا موضوع سخن یہ نہیں ہے اس لئے ان دو ہی مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ احادیث نبویہ کا اکثر حصہ قرآن پاک کی تشریح یا تفصیل یا اس سے استنباط ہے جو ﴿یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ﴾ اور ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِم﴾ جیسے نصوص کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت میں داخل ہے اور قرآنی نصوص و بینات ہم کو یہ بھی بتلاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی یہ تشریحات وتفریعات اور استنباطات بھی واجب القبول اور واجب الاتباع ہیں، اس کے بعد قرآن کریم کی بیان کی ہوئی ایک اور حقیقت پر غور کیجئے۔

تعلیم حکمت: قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فریضہ بتایا ہے، یہ حکمت کیا چیز ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے فکر صحیح اور فہم سلیم کی ضرورت ہے، حکمت کی مراد معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے خود قرآن پاک کی طرف رجوع کیجئے تو اس میں آپ کو ایسی متعدد آیات ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی ایک

ایسی چیز ہے جسے اللہ نے اتارا اور نازل کیا ہے، مثلاً سورۂ نساء میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْماً.﴾ (النساء: ع ۱۷)

اور نازل کی اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اور سکھایا تجھ کو وہ جو تو نہیں جانتا تھا، اور ہے اللہ کا فضل تجھ پر بڑا۔

سورۂ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا:

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ.﴾ (بقرہ: ع ۲۹)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت اپنے اوپر اور جو نازل کی تم پر یعنی کتاب اور حکمت، نصیحت کرتا ہے اللہ تم کو اس کے ساتھ۔

سورۂ احزاب کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں میں ہوتی تھی، ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ.﴾ (احزاب: ع ۴)

اور یاد کرو اس کو جس کی تلاوت ہوتی ہے تمہارے گھروں میں یعنی اللہ کی آیتیں اور حکمت۔

سوال یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کے علاوہ کیا سناتے تھے؟

اس سوال کا صرف یہی ایک جواب ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی حدیث اور آپ کی سنت تھی یعنی آپ کے عام دینی نصائح اور دینی افادات وارشادات، اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے ذکر کا (یعنی اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم ہے اس لئے اس آیت سے

حدیث وسنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہوگیا، اور یہ بات بھی تقریباً بدیہی اور مسلم ہے کہ علم وذکر وحفظ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ عمل کے لئے مقصود ہیں اس لئے اسی آیت سے حدیث وسنت پر عمل کا واجب اور مامور بہ ہونا بھی معلوم ہوگیا۔

اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے تو اس سے پہلی آیتوں سے (جن میں کتاب کی طرح حکمت کو بھی منزل من اللہ فرمایا گیا ہے) ثابت ہوا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن کے بعد جب ہم معلم قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو جس طرح قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ ایک اور چیز بھی (جس کا نام حکمت ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اتاری ہے، اسی طرح معلم قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی ہم کو یہی بتلاتی ہیں۔

"اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ."

کہ مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی اس کے مثل دی گئی۔

(رواہ ابوداود وابن ماجہ والدارمی عن المقدام بن معدیکرب)

کتاب وسنت کے انہیں نصوص کی بنا پر تمام ائمہ وعلمائے سلف اس بات میں متفق ہیں کہ ﴿یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے اس سے مراد سنت ہی ہے، اور سنت بھی وحی الٰہی کی ایک قسم ہے، چنانچہ علامہ ابن قیمؒ کتاب الروح میں لکھتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی اَنْزَلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَحْيَيْنِ وَاَوْجَبَ عَلٰی عِبَادِهِ الْاِيْمَانَ بِهِمَا وَالْعَمَلَ بِمَا فِيْهِمَا وَهُمَا الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ وَقَالَ تَعَالٰی: "وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" (النساء: ۱۱۳) وقال

تعالیٰ: ﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعه:۲) وقال تعالیٰ: ﴿وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ آیَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ (الاحزاب: ۳٤) وَالْكِتَابُ هُوَ الْقُرْآنُ وَالْحِكْمَةُ هِیَ السُّنَّةُ بِاتِّفَاقِ السَّلَفِ وَ مَا أَخْبَرَ الرَّسُوْلُ عَنِ اللّٰهِ فِیْ وُجُوْبِ تَصْدِیْقِهٖ وَالْإِیْمَانِ بِهٖ كَمَا أَخْبَرَ بِهِ الرَّبُّ تَعَالیٰ عَلیٰ لِسَانِ رَسُوْلِهٖ هٰذَا أَصْلٌ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ بَیْنَ أَهْلِ الْإِسْلَامِ، لَا یُنْكِرُهٗ إِلَّا مَنْ لَّیْسَ مِنْهُمْ وَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ إِنِّیْ أُوْتِیْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ". (ص:۹۲)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن اور حکمت ہیں (اس کے بعد علامہ نے اس دعوہ کے ثبوت میں وہی قرآنی آیات درج کی ہیں جو اوپر پیش کی جا چکی ہیں جن میں کتاب وحکمت کی تنزیل وتعلیم کا ذکر اور ان کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم ہے ان آیات کو درج کرنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں) کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے، رسولؐ نے اللہ سے پا کر جو خبر دی اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں یہ اہل اسلام کا بنیادی اور متفق علیہ مسئلہ ہے اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اس کے مثل ایک اور چیز بھی دی گئی (یعنی سنت)۔

اسوۂ رسول ﷺ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی جو تشریح وتبیین فرمائی اور وہ حکمت جو آپ پر نازل کی گئی، ہر مومن بالقرآن کے لئے ان دونوں کا واجب ہونا آپ

معلوم کر چکے، ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز جس کی پیروی ہر مومن پر قرآن نے لازمی قرار دی ہے وہ ہے پوری اسلامی و مذہبی زندگی کا وہ نمونہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جلوہ گر تھا، سورۂ احزاب میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً.﴾ (احزاب: ع ۳)

تمہارے لیے بھلی تھی سیکھنی چال رسول اللہ کی، اس کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے زندگی کے ہر مرحلہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کا حکم ہم کو دیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف جنگ کی حالت میں اور پریشانی کے موقع پر آپ کے صبر وضبط کی مثال سامنے رکھنے اور فقط اس کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہو، جیسا کہ اس آیت کے متعلق آج کل کے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، اس لئے کہ اس کی تو کوئی کمزور سے کمزور وجہ نہیں ہوسکتی کہ جنگ کے موقع پر تو آپ کا طرز عمل واجب الاتباع ہے مگر امن وصلح کے موقع پر آپ کا طرز عمل لازم الاتباع نہیں ہے، یا باب جہاد میں تو آپ کی ذات میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے مگر اقامت صلوٰۃ و ادائے حج کے باب میں آپ کی ذات میں ہمارے لیے کوئی قابل پیروی نمونہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ پر اس شخص کو جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرتا ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم بالکل عموم واطلاق کے ساتھ دیا گیا، ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.﴾

(آل عمران: ع ۴)

کہئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے پیچھے چلو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہاں اللہ کی محبت کا معیار مطلقاً نبی کا اتباع قرار دیا گیا، اگر رسول کی ذات اسوۂ

عمل نہیں ہے اور قرآن کے ماننے والے اس کی پیروی کے مامور نہیں ہیں تو بتلایا جائے کہ اللہ نے اپنے نبی سے اپنی پیروی کرانے کو کیوں کہا؟

یہ کہنا تو عقل وفہم کی رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ''میری پیروی کرو'' کا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں جو قرآن سناتا ہوں بس اس کو سن لو، اس لئے کہ اتباع یا پیروی یا پیچھے چلنے کا یہ مطلب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوتا، ان الفاظ کے معنی تو کسی کے طرز عمل کی تقلید اور کسی کے طور طریقہ پر کاربند ہونے ہی کے آتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ہر حق طلب اور حق پسند کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح آ گئی ہوگی کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو مجرد قرآن کے ماننے اور اپنے اپنے طور پر اس کو سمجھنے اور اپنے اپنے ذہن کے مطابق اس پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ قرآن کے ساتھ حکمت کو بھی ماننے اور قبول کرنے اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ عمل قرار دینے کے بھی وہ مامور ہیں، نیز قرآن پاک کو رسول سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ انہیں کی تعلیم وتبیین اور تشریح کی روشنی میں سمجھنے کے وہ مکلف ہیں۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۱) قرآن پاک کی جو تبیین فرمائی اور تعلیم دی (۲) اور وہ حکمت جو آپ پر اتاری گئی، (۳) نیز آپ کی پوری زندگی جس کا مکمل نقشہ ان خوش قسمتوں نے ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے، جنہوں نے اس زندگی کا مشاہدہ کیا تھا، انہیں تینوں چیزوں کا نام حدیث وسنت ہے، اور نصوص کتاب اللہ کی رو سے ان تینوں کے واجب القبول ہونے کا مطلب بالفاظ دیگر یہ ہے کہ قرآن، حدیث وسنت کو واجب القبول اور واجب الاتباع قرار دینا ہے۔

حدیث کے حجت ہونے کی ایک اور قرآنی دلیل: حدیث حجت ہے یا نہیں؟ اور اس کو کوئی مسلمان نظر انداز کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ بھی خود قرآن پاک کا بتایا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے اتباع

سبیل المومنین (مومنین اولین کے طریقہ پر چلنے) کو ضروری بتایا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْراً.﴾
(النساء:ع ۱۷)

اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے بعد اس کے کہ واضح ہوگئی اس کے لیے ہدایت اور راہ پکڑے مومنین کے راستہ سے الگ ہم حوالہ کریں گے اس کو اس راہ کے جن کی طرف اس نے رخ کیا ہے اور انجام کار ہم اس کو داخل کریں گے دوزخ میں اور برا ہے وہ ٹھکانا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مومنین کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کو سخت وعید سنائی ہے اور اس کو مستحق دوزخ قرار دیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں بھی یہ معلوم کیا جائے کہ مومنین اوّلین کا راستہ کیا تھا؟ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال گویا بلفظ دیگر حدیث وسنت کو حجت مانتے اور اس کو مشعل راہ قرار دیتے تھے یا نہیں؟ پس جب ہم اس باب میں مومنین اولین کی راہ وروش معلوم کرنے کے لیے اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم کو حسب ذیل حالات وواقعات ملتے ہیں۔

(۱) تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۹ میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی قضیہ آتا تھا تو پہلے وہ کتاب اللہ میں نظر فرماتے تھے، اگر کتاب اللہ میں ان کو مل جاتا تو وہی فیصلہ صادر فرماتے، اس میں ناکامی کی صورت میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت اس باب میں انہیں معلوم ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر خود ان کو اس باب میں کسی سنت کا علم حاصل نہ ہوتا تو باہر نکل کر دوسرے مسلمانوں (صحابہ) سے دریافت فرماتے کہ ایک اس طرح کا معاملہ میرے پاس آیا ہے اگر تم کو معلوم ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے معاملہ میں کیا فیصلہ کیا ہے تو بتاؤ، پھر ایسا ہوتا تھا کہ بعض اوقات کئی کئی آدمی اکٹھا ہو کر بتاتے تھے کہ ہاں اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

فیصلہ کیا تھا، اس وقت حضرت ابوبکرؓ فرماتے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْنَا مَنْ یَّحْفَظُ عَنْ نَبِیِّنَا."

(خدا کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ بنائے جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں۔)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اور سب سے مشکل مسئلہ یہ سامنے آیا کہ آپ کا جانشین کس کو مقرر کیا جائے تو اس مسئلہ کا حل بھی صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تلاش کیا۔

طبقات ابن سعد و تاریخ الخلفاء وغیرہ میں حضرت علیؓ کا قول منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم نے اپنے معاملہ (مسئلہ جانشینی) میں غور وفکر کیا تو ہم نے یہ پایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیقؓ کو اپنی زندگی میں نماز کے لیے آگے بڑھایا (یعنی امام مقرر کیا) تو جس کو آپ نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا تھا ہم نے اس کو اپنی دنیا کے لئے بھی پسند کرلیا اور ابوبکر کو آگے بڑھایا، جانشین رسول منتخب کرلیا۔

تاریخ الخلفاء وغیرہ میں حضرت ابن مسعود کا بیان مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار کی زبانوں پر یہ بات آئی کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم (مہاجرین) میں سے ہو، یہ بات حضرت عمر کو معلوم ہوئی تو انہوں نے انصار کے پاس جا کر کہا اے گروہ انصار! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو مامور فرمایا کہ وہ لوگوں کی امامت کریں، اگر جانتے ہو تو بتاؤ کہ کس کا دل گوارا کرتا ہے کہ ابوبکر سے آگے بڑھے، یہ سنتے ہی انصار کی آنکھیں کھل گئیں اور بول اٹھے۔

"نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ نَتَقَدَّمَ اَبَا بَکْرٍ."

خدا کی پناہ کہ ہم ابوبکر سے آگے بڑھیں۔

یعنی سنت نبی سامنے آجانے کے بعد تمام انصار مطمئن ہو گئے اور بے چوں و چرا

اس کو تسلیم کرلیا۔

نیز اسی کتاب میں ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد انصار کے مجمع میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت سعدؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سعد! تم جانتے ہو، تم بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا تھا "قُرَیْشٌ وُلَاۃُ ھٰذَا الْاَمْرِ" (اس امر کے والی قریش ہیں) حضرت سعدؓ بے تامل بولے کہ آپ نے سچ کہا، ہم وزیر و پشت پناہ ہوں گے، اور آپ لوگ امیر و والی (یعنی آنحضرت کا قول یاد دلانے کے بعد ان حضرات نے خلافت کا خیال چھوڑ دیا)۔

(۳) وفات نبوی کے بعد دوسرا مرحلہ آپ کے دفن کا تھا، اس میں اختلاف رائے تھا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے، اس کا فیصلہ بھی حدیث نبوی سے ہوا۔

اسی کتاب اور دوسری بہت سی کتب (مثلاً تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۲۵) میں ہے کہ جب یہ اختلاف رائے ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہر نبی اپنی اس خواب گاہ کے نیچے مدفون ہوتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو" یہ سنتے ہی سارا اختلاف ختم ہو گیا، اور باتفاق رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقدس سرزمین میں جہاں آپ کی روح پاک قبض کی گئی تھی سپرد خاک کیے گئے۔

(۴) تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم واقعہ جمع قرآن کا واقعہ ہے، حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو جب یہ مشورہ دیا کہ پورا قرآن یکجا کر دیا جائے اور ابتدا سے انتہا تک یکجا لکھ کر ایک مصحف میں دو لوحوں کے درمیان محفوظ کر دیا جائے تو حضرت ابوبکر ابتداء بار بار یہی فرماتے تھے کہ:

"کَیْفَ أَفْعَلُ شَیْئاً لَمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ."
(میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا)۔

پھر حضرت ابوبکر کو شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو بلا کر جمع قرآن کی اہم خدمت ان کے سپرد کرنا چاہی تو ابتداء میں ان کو بھی تامل ہوا اور وہ بھی بار بار یہی کہتے تھے "کَیْفَ تَفْعَلَانِ شَیْئاً لَمْ یَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلّی اللّٰه علیه وسلم"، لیکن بعد میں اللہ نے ان کے سینہ کو بھی کھول دیا اور شیخین کی رائے کا حق ہونا ظاہر کر دیا تو وہ اس خدمت کی انجام دہی پر کمر بستہ ہو گئے۔

اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ مقصد ہے کہ اس سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو ہر کام میں اقدام کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ وسلم کی سنت کی تلاش و جستجو ہوتی تھی، یہی ان کی روش اور ان کا راستہ تھا۔

(۵) موطأ امام مالک میں ہے کہ ایک آدمی کی وفات کے بعد اس کی دادی حضرت ابوبکر کی خدمت میں اپنی میراث طلب کرنے آئی، آپ نے فرمایا:

"مَالَكِ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ شَیْئٌ وَمَا عَلِمْتُ لَكِ فِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ شَیْئاً فَارْجِعِیْ حَتّٰی أَسْأَلَ النَّاسَ."

کتاب اللہ میں تیرا کچھ حق نہیں ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تیرا کوئی حق مجھے معلوم نہیں، لہٰذا اس وقت لوٹ جا، تا آنکہ میں اور لوگوں سے دریافت کروں۔

اس کے بعد انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہؓ نے بتایا کہ میری موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کی دادی کو سدس (چھٹا حصہ) دلوایا تھا، حضرت ابوبکر نے پوچھا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ تو حضرت محمد بن مسلمہ انصاری نے بھی کھڑے ہو کر وہی بیان کیا، اس کے بعد حضرت ابوبکر نے اس عورت کو سدس دلوا دیا۔

(۶) پارسیوں کا ملک اسلامی مقبوضات میں داخل ہونے کے بعد حضرت عمر کو فکر لاحق تھی کہ پارسیوں سے جزیہ لیا جائے یا نہیں (اس لئے کہ قرآن پاک میں صرف اہل کتاب

سے جزیہ لینے کا ذکر ہے اور قرآن کی زبان میں اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہوتے ہیں) تا آنکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے شہادت دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے، تب حضرت عمر نے پارسیوں سے جزیہ لیا۔

(۷) صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت ابن عباس سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کی وفات کے صرف چالیس دن بعد بچہ جنا تو اس کی عدت پوری ہوگئی یا نہیں؟ حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ وضع حمل اور چار ماہ دس دن پورے ہونے میں سے جو بعد میں واقع ہوگا اس سے عدت منقضی ہوگی، اس مجلس میں حضرت ابوسلمہ اور حضرت ابوہریرہؓ بھی موجود تھے، ابن عباس کا جواب سن کر ابوسلمہ نے کہا (قرآن میں ہے)۔

﴿وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَ﴾ حمل والی عورتوں کی مدت وضع حمل ہے۔

حضرت ابوسلمہ کا مطلب یہ تھا کہ صورت مسئولہ میں عدت پوری ہوگئی، یہ سن کر حضرت ابوہریرہؓ بولے کہ میں بھی اپنے بھتیجے ابوسلمہ سے اتفاق کرتا ہوں، تب حضرت ابن عباس نے اپنے غلام کریب کو حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجا، انہوں نے سوال سن کر فرمایا سبیعہ اسلمیہ حاملہ تھیں کہ اسی حالت میں ان کے شوہر شہید کر دیئے گئے واقعہ شہادت کے چالیس دن بعد سبیعہ کے بچہ پیدا ہوا اور نکاح کے پیغام آنے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح کرا دیا۔

حافظ ابن حجر اس واقعہ کے تحت فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن عباس کے شاگرد اور تبعین کا قول جماعت کے موافق ہے۔

اس واقعہ سے اختلاف رائے اور دو آیتوں میں بظاہر تعارض کے وقت صحابہ رضوان اللہ علیہم کا سنت کی طرف رجوع کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا بالکل ظاہر ہے۔

(۸) ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں ہے کہ رومی سلطنت اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ایک معاہدہ کی رو سے ایک خاص مدت تک جنگ بندی تھی، جب وہ مدت قریب ختم ہوئی تو حضرت معاویہؓ نے اپنی فوج کے ساتھ دشمن کے ملک کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا، ان کا خیال تھا کہ مدت کے اندر جنگ تو شروع نہ کریں گے لیکن ان کے قریب پہنچ جائیں گے اور جب مدت ختم ہو جائے گی تو اچانک یکبارگی دھاوا بول دیں گے، ایک دن حضرت معاویہ کو دور سے ایک سوار آتا دکھائی دیا جو بلند آواز سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا اللہ اکبر اللہ اکبر عہد کو پورا کرنا ہے، توڑنا نہیں ہے۔ لوگوں نے بغور دیکھا تو وہ سوار حضرت عمرو بن عبسہ صحابی تھے، حضرت معاویہ نے ان سے پوچھا بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جس شخص کا کسی قوم س کوئی معاہدہ ہو تو اس عہد میں کوئی ردو بدل نہ کرے، جب تک کہ اس کی مدت نہ گذر جائے، یا اس قوم کو مطلع نہ کر دے، حضرت معاویہ یہ سن کر اپنی فوج کے ساتھ دارالاسلام کو واپس ہو گئے۔

(۹) تاریخ طبری و تاریخ کامل ج ۲ ص ۲۹۲ میں ہے کہ حضرت عمرؓ ایک بار مدینہ سے بارادۂ شام روانہ ہوئے جب مقام سرغ میں پہنچے تو امرائے لشکر نے آکر خبر دی کہ ملک شام میں اس وقت وبا پھوٹ رہی ہے، طاعون بڑے زوروں کا پھیلا ہوا ہے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر پہلے مہاجرین و انصار کو جو ساتھ میں تھے اکٹھا کر کے مشورہ کیا تو وہ مختلف الرائے ظاہر ہوئے، کچھ لوگوں نے کہا لوٹ چلئے اور کچھ نے کہا جب لوجہ اللہ آئے ہیں تو لوٹیں کیوں؟ حضرت عمرؓ نے یہ اختلاف دیکھ کر ان لوگوں سے اٹھ جانے کو کہا اور فرمایا اب قریشی مہاجرین فتح کو بلاؤ، وہ آئے تو سب کے سب لوٹ جانے کے حق میں تھے، اس بنا پر حضرت عمرؓ نے واپسی کا قصد کیا، مگر حضرت ابوعبیدہ نے اس سے اختلاف ظاہر کیا، حضرت عمر اور دوسرے لوگ اس حیص بیص میں تھے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آپہونچے، وہ پہلے مشورہ میں شریک نہ ہو سکے تھے اور ان کو کچھ معلوم نہ تھا اس لئے انہوں نے پوچھا کیا

قصہ ہے، جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا میرے پاس اس باب میں ایک علم ہے، حضرت عمر نے فرمایا آپ صاحب امانت اور قابل تصدیق ہیں، بتایئے وہ کیا علم ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ:

''جب تم سنو کہ کسی سرزمین میں وبا پھیلی ہوئی ہے تو وہاں جاؤ مت، اور جب تمہارے جائے قیام میں وبا پھیل جائے تو بقصد فرار اس جگہ سے نکلو مت''۔

یہ سنتے ہی سب اختلاف مٹ گیا اور حضرت عمر سب کو لے کر مدینہ لوٹ آئے۔

(۱۰) تاریخ کامل و تاریخ الخلفاء وغیرہ تمام کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت عمر کی شہادت کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور تمام صحابہ نے حضرت عثمان کو خلیفہ منتخب کرنے کے بعد بایں الفاظ بیعت کی تھی:

"نُبَايِعُكَ عَلىٰ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ وَسُنَّةِ الْخَلِيْفَتَيْنِ بَعْدَهٗ".

ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت اس شرط پر کرتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، رسول کی سنت اور دونوں سابق خلفاء کی روش پر عمل کریں گے۔

یہ دس مثالیں بلا مبالغہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں، اس سے زیادہ کی ہم اس لیے ضرورت نہیں سمجھتے کہ ایک منصف مزاج کے لیے یہی کافی سے زیادہ ہیں اور ان کو سامنے رکھنے کے بعد کوئی بھی منصف اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ مومنین اولین کا راستہ حدیث وسنت کے ساتھ احتجاج اور ہر باب میں اس کو مشعل راہ قرار دینا تھا۔

اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اوپر ''سبیل المومنین'' کے بیان کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا اس کا ماخذ حدیث و تاریخ کی کتابیں ہیں جو صحابہ کے بعد لکھی گئی ہیں اور وہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو گذارش ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ قرآن پاک نیز اس کے احکام اور اس پر ایمان و عمل کا حکم باقی ہو اور ''سبیل المومنین'' کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ اور اس کی کوئی صورت

موجود نہ ہو، ایسا کہنا تو قرآن کو نا قابل عمل اور معطل قرار دینا ہے جس کی جرأت کوئی مومن تو مومن کوئی صاحب علم وانصاف غیر مومن بھی نہیں کرسکتا، قرآن پاک پر عمل کا دروازہ جب تک کھلا رہے گا اس وقت تک یہ راستہ بھی کھلا رہے گا اور اس راستہ کے پورے معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی موجود رہیں گے اور جب ایسا ہے تو بتایا جائے کہ بجز مجامع احادیث، وکتب طبقات واسماء الرجال اور کتب سیر وتاریخ کے اور کون سا ذریعہ ہے جس سے مومنین اولین کی راہ وروش کا تفصیلی علم حاصل ہو سکے، اگر کوئی دوسرا ذریعہ بھی ہے تو بتایا جائے، اور اگر نہیں ہے تو مذکورہ بالا چیزوں کو بالکلیہ جعلی، بے بنیاد اور بے اعتبار کہنا درحقیقت قرآن پاک پر عمل کا دروازہ بند کرنا ہے، اس کے علاوہ اسلام اور مسلم قوم کو دوسرے مذاہب واقوام عالم پر جو مخصوص تفوق وامتیاز حاصل ہے اس کو بھی برباد کرنا ہے اس لئے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مسلم قوم کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ اس کے علمی وعملی کارنامے ہیں اور نہ ان کارناموں کا کوئی ذریعہ علم دنیا میں موجود ہے، کیا ایسی بات کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں بعض منکرین حدیث کا یہ رویہ کس قدر عجیب وغریب اور کیسا ناقابل فہم ہے کہ وہ تاریخ پر اعتماد کرتے ہیں اور روایات حدیث کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے حالاں کہ کتب تاریخ کے تمام مصنفوں نے ہر ہر واقعہ کی نسبت نہ تو یہ بتانے کا التزام کیا ہے کہ وہ ان کو کس واسطہ اور کس سلسلہ سے معلوم ہوا، نہ ان واسطوں کی عدالت وثقاہت وغیرہ ان شرائط کی سختی سے پابندی کی ہے جن کی محدثین نے کی ہے، بایں ہمہ تاریخ تو قابل قبول اور لائق اعتماد ہو لیکن مجامع احادیث جن میں ہر ہر قول وفعل رسول یا آثار واحوال صحابہ کے لئے پورا پورا التزام ہے کہ مصنف کو جن واسطوں سے علم ہوا ہے ان کو سلسلہ وار اس طرح بتائے کہ کہیں انقطاع نہ ہو اور یہ واسطے بھی ایسے ہوں کہ ان کے معتبر، عادل اور ثقہ ہونے کا ثبوت موجود ہو، غرض اس التزام واحتیاط کے باوجود حدیث کے مجموعے قابل اعتبار نہ ہوں، یہ کتنی عجیب بات اور کیسی ستم ظریفی ہے۔ علاوہ ازیں پختہ اور کھری سندوں کے

ساتھ بھی حدیثوں کو نہ ماننے اور ان کو بے اعتبار کہنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی تو ہے کہ کتب احادیث کے مصنفوں نے محض بے بنیاد باتوں کو بالکل جعلی اور فرضی سندوں کے ساتھ کتابوں میں درج کر دیا ہے۔

ان حضرات کو خالص علمی طور پر کبھی تو سوچنا چاہئے کہ ایسا ممکن کیوں کر ہے؟ کیا جب احادیث کے یہ مجموعے لکھے گئے اُس وقت دنیا میں ایک بھی صحیح قسم کا مسلمان نہیں تھا جو ان ساری جعل سازی اور افترا پردازی کا مقابلہ کرتا؟ یا کم از کم اس پر نکیر ہی کرتا۔

مثال کے طور پر میں موطا کا نام لیتا ہوں، حدیث کا یہ مجموعہ بقول ابوطالب مکی ۱۱۲ھ یا ۱۲۰ھ کے بعد یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سو دس (۱۱۰) یا ایک سو بیس (۱۲۰) برس بعد وجود میں آیا (مقدمہ تنویر الحوالک ص ۶) اور اس کے وجود میں آنے سے چند برس (تقریباً ۱۳، یا ۲۳ برس) پہلے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار و گفتار سے شرف اندوز ہونے والے اصحاب رسول اس دنیا میں موجود تھے، اور ان لوگوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں جنہوں نے اصحاب رسول کی صحبت کی سعادت پائی تھی اور بلاد اسلام مثلاً بلادِ حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ کا ذکر اس وقت چھوڑ دیجئے صرف مدینہ منورہ ہی کو لیجئے، جہاں یہ کتاب وجود میں آئی اُس میں اتنی کثرت سے تابعین (جنہوں نے صحابہ کی صحبت پائی تھی) موجود تھے جن کا شمار مشکل ہے، مثال کے طور پر چند نام سنئے۔

(۱) اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ المتوفی ۱۳۶ھ
(۲) اسماعیل بن محمد بن زہری المتوفی ۱۳۴ھ
(۳) ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن المتوفی ۱۲۹ھ
(۴) زید بن اسلم المتوفی ۱۳۶ھ
(۵) سالم بن ابی امیہ المتوفی ۱۲۹ھ
(۶) سعد بن اسحاق المتوفی ۱۴۰ھ

(۷) سعید بن ابی سعید المقبری التوفی ۱۴۰ھ

(۸) سلمہ بن دینار التوفی بعد ۱۴۰ھ

(۹) شریک بن عبداللہ بن ابی نمر التوفی ۱۴۰ھ

(۱۰) صالح بن کیسان التوفی بعد ۱۴۰ھ

(۱۱) صفوان بن سلیم التوفی ۱۲۴ھ

(۱۲) عبداللہ بن ابی بکر بن ابی حزم التوفی ۱۳۵ھ

(۱۳) عبداللہ بن دینار التوفی ۱۲۷ھ

(۱۴) ابوالزناد التوفی ۱۲۵ھ

(۱۵) عبدربن سعید التوفی ۱۳۹ھ

(۱۶) محمد بن المنکدر التوفی ۱۳۱ھ

(۱۷) مخرمہ بن سلیمان التوفی ۱۳۰ھ

(۱۸) موسیٰ بن عقبہ التوفی ۱۴۱ھ

(۱۹) وہب بن کیسان التوفی ۱۳۰ھ

(۲۰) یحییٰ بن سعید قاضی مدینہ التوفی ۱۴۳ھ

(۲۱) یزید بن رومان التوفی ۱۳۰ھ

(۲۲) یزید بن عبداللہ لیثی التوفی ۱۳۹ھ

(۲۳) ہشام بن عروہ التوفی ۱۴۵ھ

(۲۴) ابوطوالہ قاضی مدینہ التوفی آخر ایام بنی امیہ (۱۳۲)

علمی سلسلہ کے علاوہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے بھی تابعین کی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے وہی تھی جو نسبی سلسلہ میں پوتوں کی حیثیت دادا کی نسبت سے ہوتی ہے، اس لیے اگر سلسلۂ اخذ و تعلیم نہ ہوتا تب بھی جس طرح دادا کے حالات اور

کارنامے پوتوں کو اپنے گھروں میں معلوم ہو جاتے ہیں اسی طرح اس عہد کے لوگوں کو باقاعدہ تعلیم کے بدون ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بکثرت حالات اور کارناموں کا علم حاصل ہونا ایک بدیہی بات ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایسے عہد اور ایسی حالت میں اور ایسے لوگوں کی موجودگی میں پھر ایسی جگہ پر جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دس سال گزرے ہیں اور جہاں کا کوئی گھر اور کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کو آنحضرت سے وابستگی اور آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہو، اس سرزمین میں ایک شخص (امام مالک) آپ کی حدیثوں اور سنتوں کے بیان میں ایک مجموعہ تیار کر کے اسی سرزمین میں اس کو علی الاعلان سناتا ہے اور ہزاروں آدمی تمام بلاد اسلامیہ سے رخت سفر باندھ کر مدینہ آتے اور اس مجموعہ کو سن کر اور بہت سے لوگ اس کی نقلیں لے کر اپنے اپنے وطن واپس جاتے ہیں اور وہاں پہونچ کر ان میں کا ہر آدمی اس کو سیکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں میں پھیلاتا ہے مگر مدینہ مقدسہ یا کسی جگہ کا ایک متنفس بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ ساری حدیثیں یا ان میں سے بہت سی جعلی ہیں۔ کوئی صاحب عقل بتائے کہ اوّلاً تو ایسی حالت میں امام مالک کو (اگر معاذ اللہ وہ مفتری ہوتے) اس کی ہمت ہی کیسے ہوتی، اور اگر بالفرض ہوتی بھی تو سارے اہل مدینہ اس افترا پردازی اور دین میں جعلی چیز کے اضافہ اور اس کی اشاعت کا خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہ جاتے؟

﴿مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾

مزید برآں یہ کہ اس مجموعہ میں امام مالک مذکورہ بالا پچیس اشخاص اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے باشندگان مدینہ کا نام لے کر فرماتے ہیں کہ انہیں لوگوں نے ہم سے یہ حدیثیں اور سنتیں بیان کی ہیں اگر بالفرض امام مالک نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو ناممکن ہے کہ جو لوگ اس وقت زندہ تھے ان کی تکذیب نہ کرتے۔ حاصل کلام یہ کہ موطا یا دوسرے مجامع حدیث اور ان کی اسنادوں کو بالکل بے سروپا کہنا صرف ضلالت ہی نہیں بلکہ قابل

عبرت جہالت وحماقت بھی ہے، ﴿وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ.﴾

یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے پہلے کسی نے یہ کہنے کی جرات نہیں کی، بلکہ اس کے برخلاف ان مجموعوں کے زمانہ تصنیف سے لے کر آج تک ہر دور میں اصولی طور پر ان کو صحیح و ثابت اور واقعی چیز تسلیم کیا گیا اور ہر دور میں ان مجموعوں کو سیکڑوں ہزاروں اہل علم نے اپنے بڑوں سے سنا اور روایت کیا، خود امام مالک سے موطا کو تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے سنا جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین میں تحریر فرمایا ہے، اور سیوطی نے تنویر الحوالک کے مقدمہ میں تقریباً پچاس ایسے آدمیوں کا نام ذکر کیا ہے جنہوں نے امام مالک سے موطا کو سن کر روایت کیا ہے، پھر ان لوگوں سے آج تک اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تواتر کے ساتھ اس کی روایت ہوتی آئی ہے۔

پھر حیرت ہے کہ یہ منکرین حدیث اس دیدہ دلیری سے حدیث کا انکار کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے اور کیوں اس پر غور نہیں کرتے کہ اپنے بزرگوں اور اکابر کے آثار کی حفاظت اور ان کے کارناموں کو زندہ اور ان کی سوانح کو یاد رکھنے کا جذبہ فطری طور پر ہر قوم میں ہوتا ہے اور دنیا میں ہر زندہ قوم اپنے بزرگوں کے آثار، بہادروں کے کارناموں اور شاعروں کے کلام کو باقی اور محفوظ رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کرتی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلم قوم جو دنیا کی سب سے بہتر اور سب سے زیادہ علم دوست اور سب سے زیادہ محاسن کمالات اور زریں خصوصیات کی حامل ہے، اس نے اور تو اور خود اپنے پیغمبر و رسول ہی کی روایات ان کے سیر و مغازی اور ان کے اخلاق و عادات کو نہ محفوظ رکھا ہو نہ دوسروں تک پہنچایا ہو، دنیا میں کون صاحب عقل ایسا کہہ سکتا ہے اور کون اس کو باور کر سکتا ہے؟

قرآن مجید کی بہت سی آیات کا مطلب بھی روایات کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا

پھر اس بات پر دھیان دینا چاہئے کہ اگر قرآن پاک کے علاوہ اور کوئی مستند ذریعہ معلومات نہ ہو اور احادیث و آثار کی روایات کو قابل اعتماد نہ رکھا جائے تو خود قرآن پاک کی بہت سی آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا، مثلاً قرآن

پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا قَضیٰ زَیْدٌ مِنْهَا وَطَراً زَوَّجْنٰکَهَا﴾ (احزاب:ع۵)

پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے اپنی غرض ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی۔

کیا روایات کو یکسر نظر انداز کر دینے کے بعد قرآن مجید کے صرف الفاظ سے اس واقعہ کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور کیا صرف قرآن سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ زید کون تھے اور اُن کی بی بی کون تھیں اور قصہ کیا پیش آیا تھا؟ یا مثلاً ارشاد ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی، اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی، وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهُ یَزَّکّٰی﴾ (عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس پر کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا اور پاک صاف ہوتا۔

بتایا جائے! کیا صرف قرآن سے یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ یہ آنے والے الاعمیٰ کون تھے اور وہ کون لوگ تھے جن کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے آنے کے وقت متوجہ تھے؟

اسی طرح غزوۂ احزاب وحنین وغیرہ کے جن واقعات کا ذکر قرآن پاک میں ہے بتایئے کہ روایات کے سارے ذخیرہ کو نامعتبر قرار دے کر ان واقعات کی ضروری تفصیل بھی کہاں سے معلوم کی جائے؟ یا مثلاً قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ.﴾ (انفال:ع۱)

اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے قبضہ میں آئے گی۔

کیا کوئی صرف قرآن سے یہ بتلا سکتا ہے کہ یہ دو جماعتیں کون تھیں؟ اور اللہ جس وعدہ کو یہاں یاد دلا رہا ہے وہ وعدہ قرآن میں کہاں ہے؟ اگر قرآن میں نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ

کوئی دوسری قسم کی وحی بھی آنحضرتؐ پر آتی تھی۔

یا مثلاً قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ جس وقت تم تھے دور کے ناکے اور وہ پرے کے ناکے اور قافلہ نیچے اتر گیا تم سے۔

کوئی مدعی صرف قرآن سے بتائے کہ یہ کہاں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور کس جگہ کے قریب و دور کے ناکے مراد ہیں؟ اور کس قافلہ کا نیچے اترنا بیان ہوا ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ﴾ (توبہ:ع۴)

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت سے میدانوں میں۔

کیا روایات کا انکار کرنے کے بعد ان بہت سے میدانوں کی تفصیل کہیں سے معلوم ہو سکتی ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (توبہ:ع۶)

اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت نکالا اس کو کافروں نے دو جان سے، جب دونوں تھے غار میں، جب کہنے لگا اپنے رفیق کو نہ غم کھا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آنحضرت کہاں سے نکالے گئے، یہ دوسرا آپ کا رفیق کون تھا؟ اور کس غار میں آپ اپنے رفیق کے ساتھ روپوش تھے؟ کیا صرف قرآن سے ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے؟ کیا روایات کی طرف رجوع کے سوا کوئی دوسری صورت بھی ان باتوں کو معلوم کرنے کی ہے؟

علی ہذا قرآن پاک میں ہے:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾ (توبہ: ع۱۳)

جس مسجد کی بنیاد دھری پر ہیز گاری پر پہلے دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اُس میں، اس میں وہ مرد ہیں جن کو چاہت ہے پاک رہنے کی۔

یہ کس مسجد کا ذکر ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کی اس آیت میں مدح ہو رہی ہے؟ اور اُن کی طہارت پسندی کا کیا خاص معیار تھا جس کو اس آیت میں سراہا گیا ہے؟ کیا ان باتوں کا جواب صرف قرآن سے مل سکتا ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ عَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا﴾ (توبہ: ع۱۴)

اور (اللہ کی مہربانی ہوئی) اُن تینوں شخصوں پر جن کے معاملہ کو ملتوی رکھا گیا تھا۔

یہ کون تین شخص ہیں اور ان کا کیا قصہ تھا اور کیوں ان کا معاملہ ملتوی رکھا گیا؟ کیا روایات کے بغیر یہ باتیں حل ہو سکتی ہیں؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقاً تَقْتُلُوْنَ وَ تَأْسِرُوْنَ فَرِيْقاً، وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضاً لَّمْ تَطَؤُوْهَا﴾

(احزاب: ع۳)

اور اتار دیا ان کو جو اُن کے رفیق ہوئے تھے اہل کتاب میں سے ان کی گڑھیوں سے اور ڈالا ان کے دلوں میں رعب، کتنوں کو تم مارنے لگے اور کتنوں کو قید کیا، اور وارث کیا تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان

کے مالوں کا اور ایک زمین جس پر نہیں ڈالے تم نے قدم۔

یہ مظاہرین کون تھے؟ اور ان کی زمین و جائداد کہاں تھی؟ نیز وہ دوسری زمین جہاں مسلمانوں کے قدم نہیں پہونچے تھے مگر اس کے وارث بنائے گئے کون سی تھی، کیا روایات سے قطع نظر کر کے ان باتوں کا جواب دیا جاسکتا ہے؟

یہ صرف چند مثالیں بلا قصد استیعاب بیان کی گئی ہیں اس طرح کی ابھی بہت سی مثالیں ذکر کی جاسکتی ہیں، مقصود یہ ہے کہ روایات کا انکار کر دینے کے بعد قرآن کی مذکورہ بالا آیات کا واضح اور متعین مفہوم سمجھنا اور سمجھانا قریباً ناممکن ہے۔

الغرض جو شخص قرآن پاک کو اللہ کی کتاب مانے اور اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہر زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ضروری سمجھے، اس کو احادیث وسیر کے اس ذخیرہ کو بھی ماننا پڑے گا جس کو پوری طرح جانچ پرکھ کے ائمہ محدثین واہل سیر نے محفوظ کیا ہے اور جس کے بہت سے حصے کی حیثیت یقیناً قرآن کے ضروری توضیحی ضمیمہ کی ہے۔

حدیث وسنت کے مثبت احکام ہونے پر ایک اور قرآنی دلیل: یہاں پہنچ کر حدیث وسنت کے مثبت احکام ہونے پر ایک اور قرآنی دلیل ذہن میں آگئی اس کو بھی یہیں عرض کرتا ہوں۔ جو حضرات واقعتاً کسی علمی مغالطہ ہی کی وجہ سے یہ بات کہتے ہیں کہ دینی حجت بس قرآن ہی ہے اور قرآن کے سوا کسی اور ذریعہ سے شریعت کا کوئی حکم اور کوئی دینی مسئلہ ثابت نہیں ہوسکتا اور رسول کا کام بس قرآن پہنچانا ہی تھا، وہ اگر ایک طالب حق اور جویائے ہدایت کی طرح قرآن مجید ہی کو غور سے دیکھیں تو اس میں اُن کو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ بطور حکایت اور واقعہ کے یا کسی اور سلسلہ میں کسی دینی عمل کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل زمانہ نزول قرآن میں ایک دینی عمل کی حیثیت سے ہوتا تھا حالاں کہ قرآن مجید میں کہیں اس عمل کا حکم نہیں دیا گیا، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم ان کو سنت

کے ذریعہ دیا گیا تھا، یہاں اس کی صرف دو تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قرآن میں حکم ثابت بالسنۃ کے ذکر کی چند مثالیں: سورۂ توبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے جنازوں کی نماز پڑھنے سے ان لفظوں میں منع فرمایا گیا ہے:

﴿وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا﴾ (توبہ: ع ۱۱)

(ان میں سے جو کوئی مرے آپ کبھی اُس کے جنازے کی نماز نہ پڑھیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے نماز جنازہ شروع ہو چکی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اموات کے جنازوں پر نماز پڑھا کرتے تھے، حالاں کہ قرآن میں اس سے پہلے نازل ہونے والی کوئی آیت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو جنازہ کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو، اس لئے ماننا پڑے گا کہ نماز جنازہ کا حکم سنت کے ذریعہ دیا گیا تھا۔

اسی طرح سورہ جمعہ کی آیت ﴿وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا﴾ (جمعہ: ع ۲) میں ایک حکایت اور شکایت کے ضمن میں جمعہ کے خطبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے اور قطع نظر اس سے ہمارا خیال ہے کہ حدیث وسنت کے جو منکرین ہمارے مخاطب ہیں وہ غالباً اس کا انکار نہ کر سکیں گے کہ خطبہ جمعہ ایک شرعی حکم اور دینی عمل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود دیا کرتے تھے اور امت میں اب تک اُسی طرح متوارث ہے، لیکن کوئی قرآنی آیت نہیں بتلائی جا سکتی جس میں اس خطبہ کا حکم دیا گیا ہو، پس لازما یہی ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم سنت کے ذریعہ ملا تھا۔

علیٰ ہذا اپنے کو مسلمان کہنے والا کوئی آدمی بھی اس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ نماز سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے یہ ایک دینی عمل ہے اور عہد نبوت سے لے کر اب تک متوارث ہے اور قرآن مجید میں بھی واقعہ کی حکایت کے طور پر ایک جگہ اس اذان کا ذکر کیا

گیا ہے مثلاً سورہ مائدہ میں عقل کے دشمن کافروں کی اس جہالت اور شرارت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ اذان کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کی نقل کر کے منہ چڑاتے ہیں ﴿وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ (مائدہ: ع۹) اسی طرح سورۂ جمعہ میں ہی ایک دوسرے حکم کے بیان کے سلسلہ میں جمعہ کی اذان کا ضمنی ذکر آیا ہے: ﴿اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ (جمعہ: ع۲) بہرحال ان آیات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عہد نبوی میں ان آیات کے نازل ہونے سے بھی پہلے اذان ایک دینی عمل کی حیثیت سے مروج تھی، اور قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں بتائی جاسکتی جس کے ذریعہ اذان کا حکم دیا گیا ہو، اس لئے ماننا پڑے گا کہ اذان کا حکم قرآن کے ذریعہ نہیں بلکہ سنت کے ذریعہ ملا تھا۔

اس کی مثالیں قرآن مجید سے اور بھی بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا صحیح مقام

ہمارے خیال میں حدیث وسنت کے منکرین کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے رسول کی اصل حیثیت اور اس کے صحیح مقام کو نہیں سمجھا ہے، اگر وہ مقام نبوت کو سمجھنے اور نبی ورسول کی معرفت حاصل کرنے کے لئے صرف قرآن ہی میں تدبر کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور پیام رساں ہی کی نہیں ہے، بلکہ آپ مطاع، متبوع، امام، ہادی، قاضی، حاکم، حَکم وغیرہ وغیرہ بھی ہیں اور قرآن ہی نے آپ کی ان حیثیتوں کو بھی بیان کیا ہے۔

(۱) رسول مطاع ہے اور اس کی اطاعت اہل ایمان پر فرض ہے:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ.﴾

اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

اس حکم میں ﴿اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ کو ﴿اَطِیْعُوا اللّٰه﴾ سے الگ مستقل جملہ کی شکل میں قرآن مجید میں جس طرح مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اس سے ہر وہ شخص جس کو عربی زبان کا کچھ بھی ذوق ہو یہی سمجھے گا کہ اللہ کی اطاعت کی طرح اہل ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے، یعنی اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کتاب رسول لائے ہیں اس کو مانا جائے اور اس کے حکموں پر چلا جائے کیوں کہ اگر صرف اتنی ہی بات کہنی ہوتی تو یہ تو ﴿اَطِیْعُوا اللّٰه﴾ میں کہی جا چکی تھی پھر امر اطاعت کے مستقل اعادہ کے ساتھ ﴿اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی۔

علاوہ ازیں خود قرآن مجید کی بعض دوسری آیات سے بھی یہ بات اور زیادہ صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔

سورۂ نساء کے پانچویں رکوع کے آخر میں اللہ ورسول کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد ان منافقین کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی غرض پرستی اور منافقت کی وجہ سے اللہ ورسول کی اطاعت میں کوتاہی کرتے تھے اسی سلسلہ بیان میں اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا.﴾ (نساء:ع۶)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کتاب کی طرف جس کو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو اے رسول! تو دیکھے گا اُن منافقوں کو کہ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں تیری طرف سے۔

اس آیت میں ﴿مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰه﴾ (یعنی کتاب اللہ) کی طرف بلانے کے ساتھ ''رسول'' کی طرف بلانے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ اوپر کی آیتوں میں اطاعت رسول کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے اس پر نازل ہونے والی کتاب کی اطاعت کرو بلکہ رسول کی اطاعت اُس سے الگ اور مستقل چیز ہے۔

اور اسی سورہ کے اس رکوع میں دو ہی آیتوں کے بعد اللہ کی طرف سے آنے والے ہر رسول کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ.﴾(نساء:ع۶)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس واسطے کہ اس کے حکم پر چلا جائے اللہ کے فرمان سے۔

(۲) رسول منجانب اللہ ہادی اور امام ہوتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا.﴾ (انبیاء:ع۵)

اور ہم نے بنایا ان کو امام و پیشوا، وہ ہدایت و رہنمائی کرتے تھے ہمارے حکم سے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منجانب اللہ حاکم اور حکم بھی قرار دیئے گئے تھے، اور ہر اختلاف ونزاع میں آپ کو حکم بنانا اور آپ کا فیصلہ دل وجان سے ماننا تمام اہل ایمان کے لئے فرض بلکہ شرط ایمان قرار دیا گیا تھا، سورہ نساء کی یہ آیت (جو پہلے بھی ایک جگہ درج ہو چکی ہے) پھر پڑھئے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً﴾ (النساء: ع۹)

اے پیغمبر! قسم تیرے پروردگار کی، یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حکم بنائیں تجھے اپنے نزاعی معاملات میں پھر (جب تو اپنا فیصلہ دیدے تو) کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائیں اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے، اور تسلیم کرلیں اُس کو پوری طرح مان کر۔

اسی طرح سورہ احزاب کی آیت:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْراً اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ (احزاب: ع۵)

اور کسی ایمان والے مرد اور ایمان والی عورت کی یہ شان نہیں ہے کہ جب حکم دیدے اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا تو رہے اُن کا کچھ اختیار اپنے معاملہ میں۔

اور سورۂ نور کی آیت:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ (نور: ع۷)

ایمان والوں کو جب بلایا جائے اللہ کی طرف اور اُس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ دیں اُن کے درمیان تو ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ (یعنی ہم نے سن لیا اور مان لیا)۔

الغرض یہ سب آیتیں اس باب میں نص صریح ہیں کہ مسلمانوں کے جس معاملہ میں رسول جو فیصلہ کریں وہ واجب التسلیم ہے اور کسی مسلمان کو اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) کسی شخص کی کامیابی اور فوز وفلاح کے لئے جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے اور جس طرح اللہ کی نافرمانی گمراہی اور بدبختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی بھی موجب ضلالت وشقاوت ہے۔

﴿"وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً﴾ (احزاب:ع۸)

جس نے اطاعت کی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اُس نے بڑی مراد پائی۔

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُّبِيْناً﴾ (احزاب:ع۵)

اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی وہ بڑی کھلی گمراہی میں جا پڑا۔

نیز قرآن ہی میں بتایا گیا ہے کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح خدا کی نافرمانی کرنے پر کف افسوس ملیں گے اور اپنا ماتم کریں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے۔

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلاَ﴾ (احزاب:ع۸)

جس دن اوندھے ڈالے جائیں گے ان کے منہ آگ میں، کہیں گے کاش ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ﴾ (النساء: ع۶)

اُس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور رسول کی نافرمانی کی کہ برابر کر دیئے جائیں زمین کے (یعنی خاک ہو کر زمین کا جزو بن جائیں اور

عذاب سے بچ جائیں)۔

نیز مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ رسول کی نافرمانی کی کوئی بات بھی آپس میں نہ کریں۔

﴿یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ مَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ﴾ (مجادلہ: ع ۲)

اے ایمان والو! جب تم چپکے چپکے آپس میں باتیں کرو تو گناہ اور ظلم و زیادتی کی، اور رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دیں اس کو قبول کرنا اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جانا واجب ہے:

﴿مَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَ مَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا﴾ (حشر: ع ۱)

جو تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

اگر اس آیت کا تعلق صرف اموال سے بھی مانا جائے تب بھی ہمارے مدعا کے لیے مضر نہیں کیوں کہ اس صورت میں بھی اتنی بات تو آیت سے ثابت ہی ہوگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صواب دید سے جو تقسیم کریں وہ اہل ایمان کے لیے واجب التسلیم ہے اور کسی کو اُس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔

(۶) ایک مومن کا اپنی جان پر جتنا حق ہے اس سے زیادہ اس کی جان پر نبی کا حق ہے۔

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ﴾ (احزاب: ع ۱)

نبی زیادہ حقدار ہے مومنوں کا ان کی جانوں سے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس آیت پر جو دو سطریں لکھی ہیں ان کے نقل کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے:

''نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی

کا اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنی روا نہیں، اور نبی حکم کرے تو فرض ہے"۔

(۷) اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری اور شرط ایمان ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (توبہ:ع۸)

اور اللہ کو اور اس کے رسول کو راضی کرنا ان کے لیے بہت زیادہ ضروری ہے اگر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

(۸) اللہ کی طرح اُس کے رسول کو بھی دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے جو ایسا نہ کریں وہ فاسقین اور اللہ کی ہدایت سے محروم رہنے والے ہیں۔

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ﴾ (توبہ:ع۳)

اے پیغمبر! (کہو مسلمانوں کو) اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور تمہارا کمایا ہوا مال اور تمہاری تجارت جس کے بند ہو جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے رہنے کے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ ساری چیزیں) تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ کرے اللہ اپنا فیصلہ، اور (یاد رکھو) کہ اللہ ہدایت نہیں دیتا فاسق لوگوں کو۔

(۹) اللہ کے رسول جب کسی کام کے لئے دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا ہر مومن پر فرض ہے۔

﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ (انفال:ع۳)

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اُس کے رسول کا جب بلاوے تم کو
اُس کام کی طرف جس میں تمہاری حیات ہو۔

(۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام کے لئے لوگوں کو بلائیں تو بلا اجازت اٹھ کر چلا جانا کسی مومن کے لیے جائز نہیں اور جو ایسا کریں گے ان کے لیے ''عذاب الیم'' کا اندیشہ ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ﴾ (النور:ع۹)

ایمان والے وہی ہیں جنہوں نے مانا ہے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور (جن کا طریقہ یہ ہے کہ) جب وہ کسی اجتماعی کام میں اس کے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو کہیں نہیں جاتے تاوقتیکہ اس سے اجازت نہ لے لیں۔

آگے اس سلسلہ میں ان لوگوں کے بارے میں جو بلا اجازت چپکے سے سرک جاتے تھے فرمایا گیا ہے:

﴿فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (النور:ع۹)

پس ڈرنا چاہئے ان لوگوں کو جو خلاف چلتے ہیں اس کے حکم سے، اس بات سے کہ مبتلا ہوں وہ کسی سخت فتنہ میں یا پہنچے ان کو دردناک عذاب۔

رسول کے مقام و منصب کا بیان ایک مستقل موضوع ہے اور اگر اس پر شرح وبسط سے لکھا جائے تو جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہے اور بلا مبالغہ سیکڑوں آیتیں اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں صرف میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب قرآن مجید سے آپ کا مطاع و متبوع، امام و ہادی، آمر و ناہی، حاکم و حکم وغیرہ وغیرہ ہونا ثابت ہو گیا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ کا آپ کا ہر امر و نہی، ہر حکم فیصلہ اور

ہر قول وعمل واجب التسلیم اور لازم القبول ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے امت نے آپ کی اور آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی یہی حیثیت سمجھی اور آپ کے ارشادات کو بلا واسطہ سننے والے اور آپ کے اعمال و افعال کو چشم خود دیکھنے والے صحابہ کرام نے علم و ہدایت کے اس پورے خزانہ کی غیر معمولی اہتمام اور شغف کے ساتھ حفاظت کی اور پوری امانت کے ساتھ بعد والوں کو پہنچایا، پھر بعد کے قرنوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے بہترین افراد کو احادیث وسنن کے اس بے پایاں دفتر کی تدوین وترتیب تحقیق اور تعلیم وتعلم، ترجمہ وتشریح، حفظ واشاعت اور اس سے متعلق بہت سے مستقل علوم وفنون کی ایجاد اور پھر ہر فن میں بہتر سے بہتر تالیف وتصنیف وغیرہ وغیرہ سیکڑوں قسم کی خدمات کی ایسی توفیق دی جو کبھی کسی قوم اور کسی امت کو نہیں ملی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اگر چہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا سے گئے ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے لیکن آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی ہر راہ رو کے لئے آج بھی ایسی ہی موجود ہے جیسی کہ قرن اول میں تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت ختم کر دئے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات وتعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی حفاظت کا یہ انتظام ہونا ضروری بھی تھا جب کہ آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے اور آپ ہی اس دنیا کی آخری نسل تک کے لئے جب نبی ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کی تعلیمات وہدایات اور آپ کا اسوۂ حسنہ اس دنیا کے آخری دن تک محفوظ رہے تا کہ ہر زمانہ کے طالبان ہدایت اس سے وہ روشنی اور وہ نور حاصل کر سکیں جو آپ کے زمانہ میں آپ پر ایمان لانے والے خوش نصیب آپ کی مقدس اور منور ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے، آج کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلی ساڑھے تیرہ صدیوں میں اللہ تعالیٰ

کی طرف سے مسلسل یہ انتظام رہا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی یہ خداوندی انتظام یوں ہی رہے گا اور اس مقصد کے لئے جب جس خدمت کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندوں کو اس کی توفیق ملتی رہے گی۔

باعتبارِ صحت، حدیث کی کتابوں کے طبقات

حدیث کے ہر طالب علم کو اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ صحت کے اعتبار سے حدیث کی کون سی کتاب کس درجہ کی ہے، مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے رسالہ "ما یجب حفظه للناظر" میں کتب حدیث کو کل پانچ طبقات پر منقسم کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

طبقۂ اولیٰ: پہلا طبقہ کتب حدیث کا جن کے مصنفین نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ان کی کتاب میں تمام احادیث صحیح کی شرط پر پوری اترتی ہوں، ایسی کتابوں کو صحاح مجردہ کہتے ہیں، چنانچہ اس طبقہ کی کتابوں میں ہر حدیث کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے مؤلف کے نزدیک صحیح ہے، لیکن نفس الامر میں بھی وہ صحیح ہو، یہ ضروری نہیں ہے، البتہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک کی تمام احادیث کے نفس الامر میں بھی صحیح ہونے پر تقریباً اتفاق ہے۔

طبقۂ ثانیہ: اس طبقہ میں وہ کتابیں آتی ہیں جن کے مؤلفین نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی حدیث درجہ حسن سے کم نہ آنے پائے اور اگر کوئی حدیث ضعیف آگئی ہے تو انہوں نے اس کے ضعف پر تنبیہ کرنے کا اہتمام کیا ہے، لہٰذا جس حدیث سے یہ لوگ سکوت کریں تو وہ ان کے نزدیک کم از کم حسن ضرور ہوگی، اس طبقہ میں سب سے اعلیٰ مقام نسائی کا ہے، چنانچہ اس میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو امام نسائی کے نزدیک حسن سے کم ہو، اِلّا یہ کہ انہوں نے خود اس کے ضعف کی تصریح کردی ہو، دوسرے نمبر پر سنن ابی داؤد ہے، اس میں بھی امام ابوداؤد جس وقت حدیث پر سکوت کریں وہ ان کے نزدیک قابل استدلال ہوتی ہے البتہ بعض اوقات حدیث کی سند میں معمولی ضعف ہوتا ہے، امام ابوداؤد اس کو گوارہ کرلیتے ہیں، اور اس پر بھی سکوت فرماتے ہیں، تیسرے درجہ پر جامع ترمذی ہے، وہ اس لحاظ سے تمام

کتب حدیث میں منفرد ہے کہ اس میں ہر حدیث کے ساتھ اس کا مرتبۂ صحت بھی صراحتہ بیان کر دیا گیا ہے، چنانچہ امام ترمذی کوئی حدیث ضعیف بغیر تنبیہ علی الضعف کے ذکر نہیں کرتے، یہ تینوں کتابیں بالاتفاق دوسرے طبقہ میں شامل ہیں۔

طبقۂ ثالثہ: اسی طبقہ میں وہ کتابیں آتی ہیں جن میں ہر طرح کی احادیث موجود ہیں، صحیح اور حسن بھی ضعیف و منکر، اور موضوع بھی، اس طبقہ کی کتابوں کا مختصر تعارف ضروری ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ: یہ اگرچہ صحاح ستہ میں شامل ہے لیکن اس میں ضعیف اور منکر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے، یہاں تک کہ اس میں کم از کم انیس (۱۹) روایات موضوع بھی ہیں اس بنا پر علماء کی ایک بڑی جماعت نے اس کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا، بعض نے اس کی جگہ موطا امام مالک کو رکھا ہے اور بعض نے سنن دارمی کو۔

(۲) سنن دار قطنی: یہ امام ابوعبداللہ الدار قطنی کی تصنیف ہے جو اونچے درجہ کے حافظ حدیث ہیں، انہوں نے اس کتاب میں ہر فقہی باب کے تحت تمام متعلقہ احادیث کو اختلاف متن وسند کے ساتھ جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے، اس لئے یہ کتاب احادیث احکام کا جامع ذخیرہ ہے، امام دار قطنی ہر حدیث ذکر کر کے اس کی سند پر مختصر کلام بھی کرتے ہیں، اس میں بھی ہر قسم کی رطب و یابس احادیث موجود ہیں، لیکن عموماً امام دار قطنی احادیث کے ضعف پر تنبیہ کر دیتے ہیں۔

(۳) السنن الکبریٰ للبیهقی: یہ کتاب فقہ شافعیؒ کے مشہور متن ''مختصر المزنی'' کی ترتیب پر لکھی گئی ہے، اس کا مقصد فقہ شافعی کے دلائل کو بیان کرنا ہے، چنانچہ امام بیہقی اپنے مسلک کے مستدلات کو بیان کرتے ہوئے احناف وغیرہ کے دلائل کی تضعیف و توہین بھی کرتے رہے ہیں، اس پر حافظ علاء الدین المارد ینی نے جو ابن الترکمانی کے نام سے مشہور ہیں ایک حاشیہ لکھا ہے جس کا نام "الجواهر النقي في الرد على البيهقي" ہے، یہ حنفی المسلک ہیں اور علم حدیث میں بلند مقام کے حامل ہیں، اس لیے امام بیہقی کے دلائل

پر تنقید کرتے ہیں۔

(۴) مصنف عبدالرزاق: یہ امام عبدالرزاق الصنعانی کی تالیف ہے، جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں اور امام بخاری وغیرہ کے استاذ الاستاذ، اس میں انہوں نے احادیث مرفوعہ کے علاوہ صحابہ و تابعین کے فتاوی بھی بکثرت نقل کئے ہیں، اور اس میں بھی ہر طرح کی احادیث ملتی ہیں، یہ کتاب اب تک نایاب تھی، اب سے تقریباً ۳۰، ۳۵ برس پہلے ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ بیروت اور ڈابھیل سے شائع ہو کر آ چکی ہے۔

(۵) مصنف ابن ابی شیبہ: یہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ کی تالیف ہے جو امام بخاری و مسلم وغیرہ کے استاذ ہیں ان کا طرز تالیف مصنف عبدالرزاق کی طرح ہے، اس کتاب کی چار جلدیں ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی تھیں پھر حضرت کے انتقال کے بعد شیخ عوامہ مدظلہ نے نئے سرے سے اس پر کام کیا اور حضرت مولانا کی تحقیق کو شامل کر کے انہوں نے پوری کتاب کو شائع کیا ہے۔

(۶) مسند الطیالسی: یہ امام ابوداؤد طیالسی کی تصنیف ہے جو صاحب سنن ابی داؤد سے مقدم ہیں۔

(۷) سنن سعید بن منصور: اس کتاب میں معضل منقطع اور مرسل احادیث بکثرت موجود ہیں۔

(۸) مسند الحمیدی: اس کے مؤلف امام بخاری کے استاذ ہیں اور امام ابوحنیفہ کے سخت مخالفین میں سے ہیں ان کی یہ کتاب بھی دو جلدوں میں مجلس علمی سے شائع ہو چکی ہے، اس تیسرے طبقہ میں اور بھی بہت سی کتابیں شامل ہیں مثلاً مسند بزار، مسند ابویعلی، مسند عبد بن حمید، مسند احمد بن منیع اور حلیۃ الاولیاء وغیرہ، اس طبقہ کی کتابوں کی کسی بھی حدیث پر اس وقت تک اطمینان نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ اس کی سند کی مکمل تحقیق نہ کر لی جائے۔

طبقۂ رابعہ: ان کتابوں کا ہے جن کی احادیث کی اکثریت ضعیف ہے جیسا کہ نوادر الاصول فی احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ابن عدی کی الکامل وغیرہ۔

طبقۂ خامسہ: ان کتابوں پر مشتمل ہے جو موضوعات کے تذکرے میں لکھی گئی ہیں، جیسے موضوعات کبریٰ لابن الجوزی یا الموضوعات للصغانی وغیرہ۔

احادیث کے راویوں کے طبقات

راویان حدیث کے طبقات دو مختلف حیثیتوں سے بیان کئے گئے ہیں، ایک راویوں کی قوت حفظ اور صحبت شیخ کے اعتبار سے، دوسرے ان کے زمانہ اور تاریخ کے اعتبار سے۔

پہلی حیثیت سے راویوں کے پانچ طبقے ہیں، جنکو علامہ ابوبکر حازمی نے اپنی کتاب "شروط الأئمة الخمسة" میں ص ۴۳ پر ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) قوي الضبط كثير الملازمة: یعنی جن کا حافظہ بھی قوی اور انہوں نے اپنے استاذ و شیخ کی صحبت بھی زیادہ حاصل کی ہو۔

(۲) قوي الضبط قليل الملازمة: یعنی جن کا حافظہ تو قوی ہو مگر اپنے شیخ کی صحبت زیادہ حاصل نہ کی ہو۔

(۳) قليل الضبط كثير الملازمة: یعنی جن کا حافظہ کمزور ہو البتہ انہوں نے اپنے شیوخ کی صحبت زیادہ حاصل کی ہو۔

(٤) قليل الضبط قليل الملازمة: یعنی جن کا حافظہ بھی کمزور ہو اور انہوں نے اپنے شیوخ کی صحبت بھی کم حاصل کی ہو۔

(٥) الضعفاء و المجاهيل: یعنی وہ رواۃ حدیث جو ضعیف اور مجہول ہیں۔

انہیں طبقاتِ خمسہ کے اعتبار سے صحاح ستہ کا درجہ استناد متعین کیا گیا ہے، امام بخاری کا معمول یہ ہے کہ وہ مستقل صرف پہلے طبقہ کی احادیث لاتے ہیں، البتہ کبھی کبھی استشہاد کے طور پر دوسرے طبقہ کو بھی لے آتے ہیں، اس لیے صحت کے اعتبار سے ان کی جامع سب پر مقدم ہے، امام مسلم پہلے دونوں طبقوں کو بلا تکلف لاتے ہیں، البتہ انہوں نے کہیں کہیں بطور استشہاد تیسرے طبقہ کو بھی لیا ہے اس لیے صحت کے اعتبار سے ان کی کتاب دوسرے نمبر پر ہے، امام نسائی پہلے تینوں طبقوں کو مستقلاً لاتے ہیں اس لیے ان کی کتاب

تیسرے نمبر کی ہے، امام ابوداؤد نے چونکہ تینوں طبقات کے ساتھ استشہاد کے طور پر طبقہ رابعہ کی روایات بھی لی ہیں اس لیے ان کی سنن کا نمبر چوتھا ہے، امام ترمذی چوتھے طبقہ کو مستقل اور بعض مقامات پر پانچویں طبقہ کی احادیث بھی لائے ہیں اس لیے ان کی کتاب پانچویں نمبر پر ہے، اور امام ابن ماجہ نے چونکہ پانچویں طبقہ کی روایات بھی بلا تکلف مستقلا ذکر کی ہیں اس لیے وہ چھٹے نمبر پر ہے، لہٰذا قوت سند کے اعتبار سے صحاح ستہ کی ترتیب یوں ہے (۱) بخاری (۲) مسلم (۳) نسائی (۴) ابوداؤد (۵) ترمذی (۶) ابن ماجہ۔

دوسری قسم یعنی تاریخی اعتبار سے راویان حدیث کے بارہ طبقات مقرر کیے گئے ہیں اور جب رجال کی کتابوں میں کسی راوی کا کوئی طبقہ بیان کیا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی تاریخی طبقات ہوتے ہیں ان تاریخی طبقات کو سب سے پہلے حافظ ابن حجر نے ''تقریب التہذیب میں بیان فرمایا، وہ طبقات یہ ہیں:

(۱) طبقة الصحابة، بلا فرق مراتب اس میں تمام صحابہ داخل ہیں۔

(۲) طبقه كبار التابعين، جیسے حضرت سعید بن المسیب۔

(۳) الطبقة الوسطىٰ من التابعين، جیسے حسن بصری و محمد بن سیرین۔

(۴) وسطی کے بعد والا طبقہ جن کی روایتیں صحابہ سے کم اور کبار تابعین سے زیادہ ہیں جیسے امام زہری، قتادہ وغیرہ۔

(۵) الطبقة الصغرى من التابعين، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے ایک یا دو صحابہ کی زیارت کی ہے لیکن ان سے روایات نہیں لیں جیسے سلیمان الاعمش۔

(۶) الطبقة الأخيرة من التابعين، یہ وہ حضرات ہیں جو پانچویں طبقہ کے معاصر ہیں لیکن انہوں نے کسی صحابی کی زیارت نہیں کی ہے جیسے ابن جریج، درحقیقت یہ تابعی نہیں ہیں لیکن تابعین کے معاصر ہونے کی وجہ سے ان کو تابعین کے طبقات میں شمار کیا گیا ہے۔

(۷) كبار أتباع التابعين، جیسے امام مالک اور سفیان ثوری۔

(۸) الطبقة الوسطىٰ من أتباع التابعين، جیسے سفیان بن عیینہ۔

(۹) الطبقة الصغرىٰ من اتباع التابعين، جیسے امام شافعی، امام عبدالرزاق وغیرہما۔

(۱۰) كبار الآخذ عن تبع الأتباع، جیسے امام احمد بن حنبل وغیرہ۔

(۱۱) الطبقة الوسطىٰ منهم، جیسے امام بخاری، امام ذہلی اور علی بن المدینی وغیرہم۔

(۱۲) الطبقة الصغرىٰ منهم، جیسے امام ترمذی اور ان کے معاصرین۔

ان بارہ طبقات میں سے پہلے دو طبقوں کے اکثر رواۃ پہلی صدی ہجری کے ہیں، اور تیسرے طبقہ سے لے کر آٹھویں طبقہ تک کے رواۃ دوسری صدی ہجری کے ہیں، اور نویں طبقہ سے لے کر بارہویں طبقہ کے رواۃ تیسری صدی ہجری کے ہیں۔

احادیث کی تصحیح وتضعیف کے اصول وقواعد

اگر چہ احادیث کی تصحیح وتضعیف ایک مستقل فن ہے، جو علم اصول حدیث اور علم جرح وتعدیل میں مدون ہو چکا ہے، اور یہاں اس کو تمام تفصیلات کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں لیکن اس سلسلہ میں چند وہ قواعد بیان کیے جاتے ہیں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں، اور حدیث کے مباحث میں ان کی ضرورت پڑتی ہے، اور جن کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے لوگ حنفیہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حنفیہ کے اکثر مستدلات ضعیف ہیں۔

پہلا قاعدہ: بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث صحیحہ صرف صحیح بخاری یا صحیح مسلم میں منحصر ہیں، نیز بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو حدیث صحیحین میں نہ ہو وہ لازماً کمزور ہوگی، اور وہ کسی حال میں بھی صحیحین کی حدیث کا معارضہ نہیں کرسکتی، حالاں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے، کیوں کہ کسی حدیث کا اعتبار اس کے بخاری یا مسلم میں ہونے پر نہیں بلکہ اس کی اپنی سند پر ہے، خود امام بخاری نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں احادیث صحیحہ کا استیعاب نہیں کیا، لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کوئی حدیث صحیحین میں نہ ہو، اور اس کے باوجود اس کا رتبہ سند کے اعتبار سے صحیحین کی بعض احادیث سے بھی بلند ہو مثلاً مولانا عبدالرشید نعمانی نے "ما تمس إليه الحاجة" میں ابن ماجہ کی بعض ایسی روایات نقل کی ہیں جن کے بارے میں محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن کی سند بخاری کی سند سے بھی افضل ہے، لہٰذا صحیحین کو جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، وہ مجموعی اعتبار سے ہے نہ کہ ہر ہر حدیث کے اعتبار سے، اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ کی "إنهاء السكن إلى من يطالع إعلاء السنن" قابل دید ہے۔

دوسرا قاعدہ: احادیث کی تصحیح وتضعیف انتہائی نازک کام ہے جس کے لئے انتہائی وسیع اور عمیق علم کی ضرورت ہے، لہٰذا اس کے اہل وہی لوگ ہیں جو اس علم میں اجتہاد کے درجہ

پر فائز ہیں، اسی بنا پر حافظ ابن صلاح نے اپنے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے بعد کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی حدیث کو نئے سرے سے صحیح یا ضعیف قرار دے لیکن جمہور نے ان کے اس خیال کی مخالفت کی ہے، اور محقق بات یہ ہے کہ صحیح کا منصب کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ علم وفہم کی مطلوبہ شرائط جس کسی میں پائی جائیں وہ تصحیح وتضعیف کا فیصلہ کرسکتا ہے، چنانچہ پانچویں صدی ہجری کے بعد بہت سے علماء نے تصحیح وتضعیف کا کام کیا ہے، اور اس کو امت نے معتبر مانا ہے، مثلاً حافظ ذہبیؒ، حافظ ابن حجرؒ، علامہ عینیؒ، حافظ سخاویؒ، حافظ زیلعیؒ اور حافظ عراقیؒ جیسے محدثین پانچویں صدی ہجری کے بعد کے ہیں، لیکن اُن کی تصحیح وتضعیف معتبر سمجھی گئی ہے۔

تیسرا قاعدہ: بعض اوقات ایک ہی حدیث یا ایک ہی راوی کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ملتے ہیں بعض حضرات اس کی تضعیف کرتے ہیں، اور بعض توثیق، سوال یہ ہے کہ ایسے موقع پر کس کے قول کا اعتبار کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا عبدالحیؒ نے "الأجوبة الفاضلة" ص ۱۶۱ تا ۱۸۰ میں مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اقوال میں ترجیح کے تین طریقے ہیں:

۱۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر دو علماء میں سے کوئی ایک تصحیح کے معاملہ میں متساہل ہو، تو دوسرے کے قول پر عمل کیا جائے گا، مثلاً ایک حدیث کی حاکم تصحیح کرتے ہیں اور حافظ ذہبیؒ اسے ضعیف کہتے ہیں، تو حافظ ذہبیؒ کا قول معتبر ہوگا، کیوں کہ حاکم متساہل ہیں، اسی طرح اگر ایک راوی کو ابن حبان ثقہ کہتے ہیں اور دوسرے حضرات غیر ثقہ قرار دیتے ہیں تو ابن حبان کا قول معتبر نہیں ہوگا، کیوں کہ بسا اوقات وہ مجاہیل کو بھی ثقات میں شمار کردیتے ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر دو محدثین میں سے کوئی ایک متشدد ہو اور دوسرا معتدل تو دوسرے کے قول کا اعتبار ہوگا، مثلاً ابن جوزیؒ بہت متشدد ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ یا حافظ ذہبیؒ معتدل ہیں، لہٰذا ابن الجوزیؒ کے مقابلہ میں ان دونوں حضرات کا قول معتبر ہوگا۔

مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل میں

زمانہ کے اعتبار سے چار طبقات ہیں، انہی طبقات میں حافظ ابن حجرؒ نے یہ بتلایا ہے کہ ان میں کون متشدد ہے اور کون معتدل؟

(۱) پہلا طبقہ شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ کا ہے، ان دونوں میں شعبہ اشد ہیں۔

(۲) دوسرا طبقہ یحیٰی بن سعید القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی کا ہے، ان دونوں میں یحیٰی اشد ہیں۔

(۳) تیسرا طبقہ یحیٰی بن معینؒ اور علی بن المدینیؒ کا ہے، ان دونوں میں یحیٰی بن معینؒ اشد ہیں۔

(۴) چوتھا طبقہ ابن ابی حاتمؒ اور امام بخاریؒ کا ہے، ان دونوں میں ابن ابی حاتمؒ اشد ہیں۔ لہٰذا جہاں ان حضرات میں باہم اختلاف ہو وہاں اشد کے قول کو چھوڑ کر متوسط کے قول کو اختیار کیا جائے گا۔

مولانا لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ ان حضرات کے بعد کے علماء میں علامہ ابن الجوزیؒ، عمر بن بدر الموصلی، علامہ جوزقانیؒ، حافظ صنعانیؒ اور صاحب سفر السعادۃ اور ابوالفتح ازدیؒ، اور علامہ ابن تیمیہؒ بھی متشدد میں سے ہیں، لہٰذا حافظ ابن حجرؒ، حافظ ذہبیؒ، حافظ عراقیؒ، اور حافظ زیلعیؒ وغیرہ جیسے معتدل علماء کے مقابلہ میں ان حضرات کے اقوال کو چھوڑ دیا جائے گا۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ فریقین کے دلائل پر غور کیا جائے اور جس کے دلائل قوی معلوم ہوں اس کا قول اختیار کیا جائے لیکن یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے علم حدیث کے متعلقات پر مکمل عبور حاصل ہو، معتدل علماء کے مابین اختلاف کی صورت میں یہی تیسرا طریقہ اختیار کیا جائے گا، یعنی اگر کسی شخص میں دونوں فریق کے دلائل کا موازنہ کرنے کی صلاحیت ہو تو وہ موازنہ کر کے کسی قول کو ترجیح دے سکتا ہے ورنہ جس کے قول پر زیادہ اعتماد ہو اسے اختیار کیا جائے۔

چوتھا قاعدہ: احادیث کی تصحیح وتضعیف ایک اجتہادی معاملہ ہے، جیسا کہ محقق ابن ہمام نے اس کی تصریح کی ہے جس میں مجتہدین کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں اور ایسی صورت میں کسی بھی مجتہد پر کوئی ملامت نہیں، نیز کسی مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال کرنا اس بات کی

دلیل ہے کہ وہ حدیث اس کے نزدیک قابل استدلال ہے، لہٰذا اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے مجتہد کا یہ قول پیش کرنا درست نہیں کہ وہ حدیث نا قابل استدلال ہے، کیوں کہ ایک مجتہد کا قول دوسرے مجتہد کے خلاف حجت نہیں ہوتا۔

پانچواں قاعدہ: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی متقدم مثلاً امام ابوحنیفہ کو ایک حدیث بالکل صحیح سند سے پہنچی، لیکن اُن کے بعد اس حدیث کی سند میں کوئی ضعیف راوی آ گیا، چنانچہ بعد کے لوگ اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ بعد کے لوگوں کی یہ تضعیف امام ابوحنیفہؒ پر حجت نہیں ہوسکتی، حنفیہ کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس قاعدہ کی تصریح کی ہے، اسی وجہ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث امام بخاریؒ کے زمانہ میں ضعیف قرار دی گئی ہو وہ پہلے زمانہ میں بھی ضعیف رہی ہو۔

چھٹا قاعدہ: حافظ ابن صلاحؒ نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جب ہم کسی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ نفس الامر میں بھی بالیقین صحیح ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں صحیح کے شرائط موجود ہیں جو محدثین نے صحیح کے لئے مقرر کی ہیں، لہٰذا ظن غالب یہ ہوتا ہے کہ وہ نفس الامر میں بھی صحیح ہوگی، اس لیے کہ نفس الامر کی صحت کا یقین تواتر کے بغیر نہیں ہوتا، لہٰذا صحیح میں بھی یہ احتمال موجود ہے کہ نفس الامری طور پر کوئی غلطی رہ گئی ہو، کیوں کہ خطا ونسیان ثقہ سے بھی ممکن ہے، اور اس کا امکان ہے کہ کسی راوی سے کوئی وہم ہوا ہو، البتہ اس احتمال پر عمل اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ اس احتمال کا ثبوت دوسرے قرائن ودلائل قویہ سے نہ ہو جائے، لہٰذا اگر دوسرے دلائل قویہ اس بات پر دلالت کرتے ہوں کہ اس حدیث صحیح پر کسی راوی کو وہم ہوا ہے تو اس حدیث کو ترک کیا جاسکتا ہے، مثلاً یہ کہ زیادہ صحیح احادیث اس کے معارض ہوں، یا وہ حدیث قرآن کریم کی کسی واضح آیت کے خلاف ہو، اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں حدیث ضعیف ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ نفس الامر میں بھی واقعتاً جھوٹی ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں صحیح یا حسن کی فنی شرائط نہیں پائی جاتیں جن کی وجہ سے وہ اتنی قابل اعتماد نہیں ہے

کہ اس پر کسی شرعی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکے، اور نہ یہ احتمال موجود ہے کہ ضعیف راوی نے بالکل سچی بات نقل کی ہو، اس لیے کہ ضعیف راوی ہمیشہ غلطی نہیں کرتا لیکن اس احتمال پر عمل اس وقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے دلائل قویہ اس کو ثابت نہ کردیں، اب بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی مجتہد کے پاس ایسے دلائل قویہ موجود ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ اس ضعیف احتمال کو راجح قرار دے کر کسی حدیث صحیح کو ترک کردیتا ہے، یا حدیث ضعیف کو اختیار کرتا ہے تو اس صورت میں اس کو حدیث صحیح کا تارک یا حدیث ضعیف پر عامل نہیں کہا جاسکتا یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی۔

امام ترمذیؒ نے "کتاب العلل" میں لکھا ہے کہ میری کتاب میں دو حدیثیں ایسی ہیں کہ جن پر کسی فقیہ کا عمل نہیں ہے، ایک حضرت ابن عباس کی روایت "قال جمع رسول اللّٰہ ﷺ بین الظهر و العصر و بین المغرب و العشاء بالمدينة من غير خوف ولا مطر" (ترمذی ج۱، ص۴۷ باب ماجاء في الجمع بين الصلوتين) حالاں کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث قابل استدلال ہے، دوسری حدیث امیر معاویہؓ کی ہے: قال قال رسول اللّٰہ ﷺ من شرب الخمر فإن عاد في الرابعة فاقتلوه) (ترمذی ج۱، ص۲۰۹، أبواب الحدود باب ماجاء من شرب الخمر فاجلدوه فإن عاد في الرابعة فاقتلوه) (حالاں کہ یہ حدیث بھی قابل استدلال ہے) ان دونوں حدیثوں کے ظاہر کو باجماع امت ترک کردیا گیا ہے، کیوں کہ دوسرے دلائل قویہ اُن کے خلاف موجود تھے، لیکن ان حدیثوں کے ترک کرنے کی وجہ سے کسی کو بھی تارک سنت نہیں کہا گیا۔

اسی طرح امام ترمذیؒ نے "أبواب النكاح باب ماجاء في الزوجين المشركين يسلم أحدهما" میں ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے "ردّ النبي ﷺ ابنته زينبؓ على أبي العاص بن الربيع بعد ستّ سنين بالنكاح الأوّل ولم يحدث نكاحاً" اس حدیث کا صریح تقاضا یہ ہے کہ اگر زوجہ مشرکہ کے اسلام لانے کے چھ سال بعد بھی اس کا پرانا شوہر مسلمان ہوجائے تو نکاح جدید کی ضرورت نہیں، حالاں کہ اس پر کسی بھی فقیہ کا عمل

نہیں، چنانچہ امام ترمذی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "هذا حديث ليس باسناده بأس ولكن لا نعرف وجه الحديث ولعله قد جاء هذا من قبل داؤود بن الحصين من قبل حفظه" یہاں پر امام ترمذی نے ایک حدیث صحیح میں راوی کے وہم کے احتمال کو دوسرے دلائل کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے۔

اس کے برعکس حدیث ضعیف پر بعض اوقات دوسرے دلائل کی وجہ سے عمل کر لیا جاتا ہے، چنانچہ اس باب میں امام ترمذیؒ نے عمرو بن شعیب کی روایت نقل کی ہے "عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ ردّ ابنته زينب علىٰ أبي العاص بن الربيع بمهر جديد ونكاح جديد"، اس حدیث کے بارے میں امام ترمذیؒ لکھتے ہیں: "هذا حديث في اسناده مقال والعمل علىٰ هذا الحديث عند أهل العلم الخ (ثم قال) وهو قول مالك بن أنس والأوزاعي والشافعي وأحمد وإسحاق"، کیا ان تمام ائمہ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے یہ عامل بالحدیث الضعیف ہیں، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے حدیث کو اس لئے اختیار کیا کہ دوسرے دلائل سے اس کی تائید ہو رہی تھی، لہٰذا اگر امام ابو حنیفہ کسی مقام پر حدیث ضعیف کو دوسرے دلائل کی وجہ سے اختیار کریں تو وہ تنہا نشانہ ملامت کیسے ہو سکتے ہیں، یہ بحث تفصیل کے ساتھ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی کتاب "إنهاء السكن مقدمة إعلاء السنن" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ساتواں قاعدہ: اگر کوئی حدیث ضعیف مؤید بالتعامل ہو، یعنی صحابہ و تابعین کا عمل اس کے مطابق ثابت ہو تو وہ اپنے ضعف کے باوجود قابل استدلال ہو جاتی ہے، (كما صرح به الجصاص في أحكام القرآن وغير واحد من المحدثين والأصوليين) مثلاً حدیث "طلاق الأمة تطليقتان وعدتها حيضتان" ضعیف ہے لیکن تعامل کی وجہ سے قابل استدلال ہوگئی، چنانچہ امام ترمذیؒ اس کے تحت لکھتے ہیں کہ "حديث عائشةؓ حديث غريب لا نعرفه مرفوعاً إلّا من حديث مظاهر بن أسلم ومظاهر لا يعرف له في العلم غير هذا الحديث والعمل علىٰ هذا عند أهل العلم من

أصحاب النبي ﷺ وغيرهم" ترمذی جلداول أبواب الطلاق باب ماجاء أن طلاق الأمة تطليقتان) اسی طرح حدیث "لاوصية لوارث (۱)" ہےاور "القاتل لايرث (۲)" کی اسانید بھی ضعیف ہیں لیکن تلقی بالقبول کی وجہ سے انہیں قابل استدلال سمجھا گیا، اسی طرح حدیث "هو الطهور ماؤه والحل ميتته" کو بہت سے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن تلقی بالقبول کی وجہ سے اسے قابل استدلال سمجھا گیا، اسی اصول کے مطابق امام ابوحنیفہ اور دیگر احناف بعض مرتبہ ایسی حدیث ضعیف کو اختیار کرتے ہیں جو مؤید بالتعامل ہو، حدیث ضعیف اگر متعدد طرق سے مروی ہو تو اس صورت میں اسے حسن لغیرہ کہہ کر قابل استدلال سمجھا جاتا ہے۔

آٹھواں قاعدہ: اگر دو قابل استدلال حدیثوں میں تعارض ہو جائے تو فقہا، محدثین کی ایک جماعت علی الاطلاق قوت سند کو وجہ ترجیح قرار دیتی ہے، اور "أصح مافي الباب" کو اختیار کر لیتی ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ایسے مواقع پر یہ ہے کہ وہ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں جو قرآن کریم یا شریعت کے اصول کلیہ کے موافق ہو، خواہ قوت سند کے اعتبار سے راجح نہ ہو، واللہ سبحانہ اعلم۔

اگر یہ قواعد ذہن میں رہیں تو بہت سے اعتراضات کا جواب معلوم ہو سکتا ہے جو عموماً حنفیہ پر عائد کئے جاتے ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

---

(۱) ترمذی (ج۲ص۴۱) أبواب الوصايا باب ماجاء "لا وصية لوارث" في حديث أبي أمامة الباهلي ۱۲۔

(۲) ترمذی (ج۲ص۴۰) أبواب الفرائض باب ما جاء "في أبطال ميراث القاتل" عن أبي هريرةؓ مرفوعاً ۱۲۔

صحیح مسلم

صحیح مسلم کے جامع ہونے اور اس کی روایات کی صحت پر علماء کا اتفاق ہے، اسی بنا پر اس کو ''الجامع الصحیح'' کہا جاتا ہے، امام مسلم کا اپنا بیان ہے کہ انہوں نے تین لاکھ مسموع حدیثوں میں سے انتخاب کر کے صحیح مسلم تیار کی ہے، آپ نے یہ کتاب تقریباً پندرہ سولہ برس میں تیار کی، مع مکررات اس میں کل بارہ ہزار حدیثیں ہیں، غیر مکرر حدیثوں کی تعداد تین ہزار تینتیس ہے، صحیح مسلم کی تصنیف میں امام مسلم کو مشہور محدث احمد بن سلمہ کا تعاون حاصل رہا ہے، کتاب کو مکمل کرنے کے بعد امام صاحب نے اسے امام ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا، امام ابوزرعہ نے جس روایت میں کوئی خفیہ علت وغیرہ بتائی امام مسلم نے اسے قلم زد کر دیا۔

امتیاز: تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتابیں بخاری و مسلم ہیں، اسی لئے تمام امت نے بالاجماع ان کو قبول کیا ہے، پھر مذہب مختار یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں سے صحیح ترین بخاری شریف ہے، نفس احادیث کے اعتبار سے بھی اور فوائد و معارف کے اعتبار سے بھی، لیکن صحیح مسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بخاری کی بہ نسبت اس سے استفادہ سہل اور آسان ہے، کیوں کہ امام مسلم نے ہر حدیث کو اس کے مناسب موقع پر ذکر فرمایا ہے، اور اس کی تمام سندوں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے، متن کے الفاظ اختلاف کو بھی ایک ہی جگہ بیان کر دیا ہے، چنانچہ طالب علم کو جمع طرق کی وجہ سے روایت کی تلاش میں بڑی مدد ملتی ہے، لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ بعض حیثیتوں سے مسلم شریف کو بخاری شریف پر فوقیت حاصل ہے۔

مقدمہ مسلم صحیح مسلم کا جزو ہے یا نہیں؟:

مقدمہ مسلم کے صحیح مسلم کا جزو ہونے کے بارے میں واضح بات یہ ہے کہ وہ من وجہٍ صحیح مسلم کا جزء اور من وجہٍ جزء نہیں ہے، علماء کرام مرویات مسلم فی الصحیح اور مرویات مسلم فی المقدمہ میں فرق کرتے ہیں فن اسماء الرجال میں یہ بھی فرق کیا گیا ہے کہ رواۃ مسلم کے لئے رمز ''میم'' اور رواۃ مقدمہ کے لئے رمز ''مق'' استعمال کیا گیا ہے، دونوں کا موضوع بھی الگ الگ ہے، صحیح مسلم کا موضوع صرف احادیث مرفوعہ متصلہ کی تخریج ہے اور مقدمہ کا موضوع عام ہے، علامہ ابن قیم ''الفروسیة'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں ان شرائط کا لحاظ نہیں کیا جو صحیح مسلم میں ملحوظ ہیں، ''لَمْ يَشْتَرِطْ مُسْلِمٌ فِيْ مُقَدَّمَةِ صَحِيْحِه مَا شَرَطَهٗ فِيْ صَحِيْحِهٖ ص۲۴۲'' مقدمہ کی صورت حال اور ہے اور باقی کتاب کی اور، محدثین کو اس معاملہ میں کوئی شک نہیں ہے، اور مقدمہ کے جزء کتاب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح مقدمۃ الجیش جیش کا جزء ہوتا ہے، مقدمۃ الکتاب کو بھی کتاب کا جزء ہونا چاہئے، بہر حال دلائل سے دونوں باتیں ثابت ہیں اس لئے علماء نے اسے من وجہٍ جزء قرار دیا اور من وجہٍ جزء قرار نہیں دیا۔

صحیح مسلم کے تراجم ابواب

تمام کتب حدیث کے برخلاف امام مسلم نے صحیح مسلم میں تراجم ابواب نہیں لکھے ہیں، مگر کتاب کے مطالعہ سے علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ امام مسلم کے ذہن میں کتاب لکھتے وقت تراجم ابواب موجود تھے، تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو معہود ذہنی کیوں رکھا؟ کتاب میں کیوں نہیں لکھا؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے، حقیقت حال کو علام الغیوب ہی بہتر جانتے ہیں، البتہ علماء نے درجہ احتمال میں مختلف وجوہ بیان کئے ہیں، مثلاً کتاب کا حجم بڑھ جانے کے اندیشہ سے ایسا کیا ہوگا مگر یہ تاویل بارد ہے یا مثلاً تجرید کے خیال سے ایسا کیا ہوگا، یعنی کتاب میں صرف مرفوع حدیثیں ہوں اس کے علاوہ کچھ اور نہ ہو یہ بات معقول نظر آتی ہے، اور ایک وجہ وہ جمع طرق بھی ہوسکتی ہے یعنی امام مسلم چونکہ ہر حدیث کی تمام سندیں اور متن کے الفاظ کا اختلاف ایک ہی جگہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور تراجم ابواب اس مقصد میں مخل بن سکتے ہیں، اس لئے انہوں نے تراجم ابواب نہیں لکھے، اور صحیح مسلم میں حاشیہ پر جو تراجم لکھے ہوئے ہیں وہ امام مسلم کے نہیں بلکہ شارح مسلم امام نووی کے قائم کردہ ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۲۰۹)

صحیح مسلم کی شروحات

صحیح مسلم کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، ان میں سے چند شروحات کا تذکرہ مختصر تعارف کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

(۱) المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج:

یہ شرح حافظ ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین نووی، شافعی المتوفی ۶۷۶ھ کی تحریر کردہ ہے، یہ شرح ہندو پاکستان وغیرہ میں رائج صحیح مسلم کے ساتھ احادیث کے نیچے لکھی ہوئی موجود ہے جو استاد اور شاگرد دونوں کے سامنے ہمہ وقت موجود رہتی ہے، اور دونوں سب سے زیادہ اسی شرح سے استفادہ کرتے ہیں، اس میں حدیث کی شرح، بیان مذاہب اور رواۃ حدیث کے اسماء کو ضبط حرکات کے ساتھ تحریر کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، کسی حد تک مذاہب کے دلائل بھی تحریر کئے گئے ہیں، البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو دلائل کے ساتھ بیان کرنے اور اسے راجح قرار دینے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔

(۲) شرح صحیح مسلم: یہ شرح علامہ ابوالفرج الزوادی، المتوفی ۷۴۴ھ کی تصنیف کردہ ہے جو پانچ جلدوں میں ہے، یہ صحیح مسلم کی متعدد شرحوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) منہاج الابتہاج: یہ احمد بن محمد الخطیب، القسطلانی، الشافعی المتوفی ۹۲۳ھ کی تصنیف ہے، یہ شرح آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور صحیح مسلم کے صرف نصف حصہ تک پہونچ سکی ہے۔

(۴) إکمال إکمال المعلم: امام ابوعبداللہ محمد بن خلیفہ، آبی، مالکی المتوفی ۸۷۷ھ کی تحریر

کردہ ہے جو چار جلدوں میں ہے، اُس میں شرح المازری، عیاض، قرطبی اور شرح النووی کا خلاصہ بہت سے مفید اضافات کے ساتھ آ گیا ہے۔

(۵) **إکمال المعلم بفوائد مسلم**: یہ شرح قاضی عیاض، مالکی، المتوفی ۵۴۴ھ کی تصنیف ہے، اور اصلاً علامہ مازری کی شرح کا تکملہ ہے اور نو جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔

(۶) **المعلم بفوائد مسلم**: ابوعبداللہ بن محمد بن علی، المازری، المتوفی ۵۳۶ھ کی تحریر کردہ ہے، تین جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی ہے، یہ اصلاً امام مازری کی درسی تقریر ہے اور نامکمل ہے، قاضی عیاض مالکی نے اس کی تکمیل کی ہے، اس لئے انہوں نے اپنی کتاب کا نام إکمال المعلم رکھا ہے۔

(۷) مسلم شریف کی ایک شرح ملا علی قاری حنفی المتوفی ۱۰۱۶ھ کی بھی ہے جو چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۸) **مکمل إکمال الاکمال**: امام ابوعبداللہ حمد بن محمد السنوسی، المتوفی ۸۹۵ھ کی تصنیف ہے، اس شرح میں علامہ ابی مالکی کی شرح پر مفید اضافے ہیں، إکمال الاکمال المعلم اور مکمل إکمال الاکمال یہ دونوں شرحیں ایک ساتھ بیروت سے شائع ہوئی ہیں۔

(۹) **المفہم لما اشتمل فی تلخیص کتاب مسلم**: یہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابی ابراہیم القرطبی، المتوفی ۶۵۶ھ کی تصنیف ہے، موصوف نے پہلے مسلم شریف کی تشخیص و تبویب کی ہے، بعدہ اس کی شرح لکھی ہے، بقول مصنف ان کی اس شرح میں توجیہ واستدلال کے علاوہ اعراب کے نکات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

(۱۰) **الدیباج**: شیخ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر، السیوطی، المتوفی ۹۱۱ھ کی تحریر کردہ ہے، یہ باقاعدہ کوئی شرح نہیں ہے بلکہ اس میں جستہ جستہ مقامات پر اختصار کے ساتھ کلام

کیا گیا ہے، یہ شرح ادارۃ القرآن، کراچی سے دوجلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۱۱) الحل المفہم: یہ کتاب فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، المتوفی ۱۳۲۳ھ کے درس مسلم کا مجموعہ ہے جو نہایت اختصار کے باوجود انتہائی مفید ہے۔

(۱۲) فتح الملہم: صحیح مسلم کی یہ بے نظیر شرح علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، دیو بندی نور اللہ مرقدہ کی تصنیف کردہ ہے، اس سے پہلے صحیح مسلم کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ محقق اور جامع ہے، مگر یہ شرح علامہ عثمانی کے قلم سے صرف ''کتاب الطلاق'' تک ہی پہونچ سکی ہے، امام مسلمؒ کے مقدمہ سے پہلے حضرت عثمانی نے ایک مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس میں علم حدیث اور اصول حدیث سے متعلق نہایت اہم اصول اور ضوابط بیان کئے ہیں، اور اپنی شرح کی خصوصیات کا بھی تذکرہ کیا ہے، علامہ عثمانی کی یہ شرح احادیث کی شرح اور مختلف مواقع پر رجال کی بحث کے ساتھ اسرار حدیث کے بیان پر بھی مشتمل ہے۔

علامہ عثمانی کی وفات کے کافی عرصہ بعد علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے ''کتاب الرضاع'' سے ''فتح الملہم'' کی تکمیل کا کام شروع کیا جس کا معیار تحقیق بھی نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے، اور بہت سے مسائل میں اسے انفرادی شان حاصل ہے تکمیل کے بعد اب یہ شرح بارہ جلدوں میں ہندو پاک کے علاوہ تقریباً عالم اسلام کے تمام کتب خانوں میں دستیاب ہے، چھ جلدیں علامہ شبیر احمد عثمانی کے قلم سے ہیں اور بقیہ چھ جلدیں مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کے قلم سے۔

مذکورہ بالا شروحات کے علاوہ صحیح مسلم کی اور بھی متعدد شرحیں ہیں چنانچہ ابھی قریبی زمانہ میں ہی ایک کتاب ''الامام مسلم بن الحجاج ومنہجہ فی الحدیث'' دوجلدوں میں شائع ہوئی ہے جس میں صحیح مسلم کی اکثر شرحوں کا تذکرہ مع اسماء مولفین درج ہے۔

صحیح مسلم کے مستخرجات

متعدد علماء نے صحیح مسلم پر مستخرجات بھی تحریر کئے ہیں، مستخرجات مسلم میں دو مستخرج زیادہ مشہور ہیں:

(۱) الامام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق المتوفی ۳۱۶ھ کا استخراج جو "المستخرج علی صحیح مسلم" کے نام سے معروف ومشہور ہے جس کا اصل نام "مسند ابی عوانہ" ہے۔

(۲) الامام ابونعیم احمد بن عبداللہ بن احمد الاصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ کا مستخرج جو چار جلدوں میں ہے، اور "المسند المستخرج علی صحیح مسلم" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(حاشیہ درس مسلم ص ۱۱۰)

تلخیصات صحیح مسلم

صحیح مسلم کی تلخیصات میں مشہور احمد بن عمر قرطبی اور ذکی الدین عبدالعظیم منذری کی تلخیص ہے۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۲۰۹)

صحیح مسلم کا مقام اور اس کا امتیاز

صحیح مسلم محدثین اور علماء کے نزدیک بالاتفاق حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، اور دنیا کی تمام کتابوں میں قرآن کریم اور صحیح بخاری کے بعد تیسری سب سے صحیح کتاب ہے، یہ کتاب جس محنت شاقہ سے ترتیب دی گئی ہے اس کا اندازہ تو اس کا مطالعہ کرنے ہی سے ہو سکتا ہے، اس وجہ سے امام موصوف کو اپنی صحیح پر بڑا ناز تھا، وہ خود فرماتے ہیں: "لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْحَدِيثِ يَكْتُبُونَ مِائَتَيْ سَنَةٍ الحديث فَمَدَارُهُمْ على هذَا الْمُسْنَدِ" (محدثین اگر دوسو سال تک حدیث لکھتے رہیں تو بھی اس مسند کے محتاج رہیں گے) حافظ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "سَمِعْتُ أَبَا عَلِيٍّ النَّيْشَابُورِيَّ يَقُولُ مَا رَأَيْتُ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ أَصَحَّ مِنْ كِتَابِ مُسْلِمٍ" امام مسلم کی فن حدیث میں مہارت اور ان کی صحیح کی شان اتنی عظیم ہے جس کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

صحیح مسلم کی امتیازی خصوصیات:

صحیح مسلم کی وہ خصوصیات جو اس کو دوسری تمام کتب احادیث سے ممتاز کرتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

پہلی خصوصیت:

حسن ترتیب، یہ صحیح مسلم کی سب سے اہم اور ممتاز خصوصیت ہے، امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک موضوع سے متعلق تمام احادیث جو ان کی شرط کے مطابق تھیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں، اس سے حدیث پڑھنے والے طلباء اور متخصصین فی الحدیث کو بڑی سہولت اور فن حدیث کا ذوق پیدا کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، دوسری کتب احادیث میں یہ خصوصیت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

دوسری خصوصیت: حسن ترتیب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک موضوع کی احادیث کو ایک باب میں اس ترتیب سے جمع کیا ہے کہ ہر آنے والی حدیث سابق حدیث کی شارح ہے، چاہے وہ لفظ کی تشریح ہو یا کسی معنی کی تشریح، نحوی ترکیب کی تحلیل ہو یا صرفی قواعد کی تعلیل، سند میں کسی راوی کے نام، کنیت، لقب یا نسبت سے متعلق کوئی تشنگی ہو یا متن میں کوئی معنوی الجھن، باب کی تمام احادیث پڑھتے جایئے تمام تشنگی اور الجھنیں بہت حد تک دور ہوتی جائینگی، ہر آنے والی حدیث میں لفظ کا مترادف ملتا جائیگا، راوی کی کنیت کی جگہ اس کا نام آئیگا یا اور کوئی وضاحت ضرور آئے گی، مثال کے طور پر اگر ایک حدیث میں قعد یا اور کوئی لفظ آیا ہے تو اس کے بعد والی احادیث میں جلس یا اس کا کوئی مترادف ضرور ملے گا، اس طرح اگر ایک حدیث میں جملہ اسمیہ استعمال ہوا ہے تو اس کے بعد آنے والی حدیث میں اس معنی کو ادا کرنے کے لئے جملہ فعلیہ لایا گیا ہوگا، گویا باب کی پوری احادیث پڑھنے کے بعد اصل مضمون اور اس کا اجمالی مفہوم سامنے آجاتا ہے یہ کمال مہارت کی بات ہے۔

تیسری خصوصیت: امام صاحب نے اپنی صحیح کی تالیف میں انتہائی حزم واحتیاط اور کامل ورع وتقویٰ سے کام لیا ہے، بہت سے محدثین حدیث روایت کرنے کے صیغے مثلاً ''حدثنا، حدثني، أخبرنا، أخبرني'' کے درمیان فرق نہیں کرتے لیکن امام صاحب ان الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہیں، جہاں اس کا تقاضا ہے وہیں استعمال کرتے ہیں، یہ ان کے اعلیٰ درجہ کے ذوق اور حدیث بیان کرنے میں کمال درجہ کی احتیاط وامانت کی دلیل ہے، یہ احتیاط بہت کم محدثین کے یہاں ملتی ہے، اگر چہ متقدمین محدثین کے یہاں ان صیغوں کے استعمال میں یہ گنجائش ہے کہ ایک صیغہ کو دوسرے صیغہ کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں، لیکن امام صاحب نے رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرنے کو پسند فرمایا۔

چوتھی خصوصیت: امام مسلم رحمہ اللہ کے تقویٰ وامانت داری اور حدیث پاک

کے تقدس نیز اس سے اعلیٰ درجہ کے عشق کی دلیل ہے کہ احادیث بیان کرنے کے تسلسل کے دوران احادیث رسول ﷺ کے علاوہ کوئی اپنی بات داخل نہ کی جائے، اس لئے آپ نے ایک موضوع کی تمام احادیث ایک جگہ جمع کر کے قارئین کے حوالہ کر دیا، سلسلہ حدیث کے درمیان اپنی طرف سے کوئی ترجمۃ الباب قائم نہیں کیا، اور نہ ہی کسی حدیث پر کوئی فقہی مسئلہ یا تشریحی جملہ یا سندی بحث کو چھیڑا، شاید امام مسلم رحمہ اللہ کا یہ ماننا ہے کہ حضور ﷺ کے اقوال، افعال وتقریرات مبارک کے درمیان کسی اور کا کلام ہونا حدیث پاک کی بے ادبی ہے، جب کہ دوسرے محدثین کے یہاں بغیر تبویب کے کوئی حدیث پیش ہی نہیں کی جاتی، صحیح مسلم کے جتنے قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے حاشیے پر جو ابواب ہیں وہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یا دوسرے شارحین صحیح مسلم نے قائم کئے ہیں۔

پانچویں خصوصیت: متعلمین اور قارئین کے اندر حدیث کا صحیح ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے اور وہ حدیث کو صرف حدیث سمجھ کر پڑھیں، اس کو کسی اور فن کے سانچے میں نہ پڑھیں، تاکہ طالبان حدیث کے اندر حدیث اور صاحب حدیث سے حقیقی عشق اور سچی محبت پیدا ہو، اس کے لئے ضروری تھا کہ قارئین ومتعلمین کے سامنے صرف متن حدیث پیش کیا جائے اور مؤلف کی طرف سے کسی حدیث پر کوئی تبصرہ نہ کیا جائے، اور فقہی مسالک، ائمہ کے اختلافات اور اسکے دلائل نیز دیگر مباحث کو نہ چھیڑا جائے، تاکہ ان میں حدیث کی روح منتقل ہو سکے، امام مسلم رحمہ اللہ نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے، اور اس کا بھرپور اہتمام کیا ہے، جبکہ دوسری بہت سی کتب احادیث میں یہ خصوصیت شاذ ونادر ہی ملتی ہے۔

چھٹی خصوصیت: امام مسلم رحمہ اللہ ایک حدیث کئی کئی طرق واسانید سے پیش کرتے ہیں، اور اسانید میں تحویلات صحیح مسلم سے زیادہ دوسری کتب احادیث میں نہیں ملتی ہیں، جس حدیث میں مختلف طرق اور تحویل اسانید ہوتی ہے، امام مسلم رحمہ اللہ اس کو اختصار

کے ساتھ نہایت عمدہ عبارت میں پیش کرتے ہیں، نیز اگر اس میں راویوں کے درمیان لفظ اور تعبیر کا اختلاف ہوتا ہے تو "واللفظ لفلان" کہہ کر اس بات کی صراحت کر دیتے ہیں کہ حدیث میں مذکور الفاظ کس راوی کے ہیں۔

ساتویں خصوصیت: امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کے جمع و ترتیب میں اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ اس میں صرف مرفوع حدیثیں جمع کی جائیں، اور راوی سب کے سب ثقہ ہوں اور ان کی صحت پر علماء کا اتفاق ہو، موقوف احادیث اور آثار صحابہ سے حتی الامکان احتراز کیا جائے، اسی لئے اس مجموعہ میں موقوف احادیث اور صحابہ کے آثار شاذ و نادر ہی ملیں گے، اگر کہیں ہیں بھی تو وہ ضمناً ہیں اصالۃً نہیں، اور اس کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

آٹھویں خصوصیت: امام مسلم علیہ الرحمہ نے اپنی صحیح میں مکررات سے بہت حد تک اجتناب کیا ہے، جہاں کہیں بھی کوئی حدیث بظاہر مکرر نظر آتی ہے یا تو اس کے الفاظ بدلے ہوئے ہوں گے یا وہ حدیث دوسری سند سے لائی گئی ہوگی یا مضمون حدیث میں کچھ نہ کچھ حذف و اضافہ کیا گیا ہوگا، یا مدار سند میں تبدیلی ہوگی، الغرض کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور ہوگی من وعن وہی حدیث اسی سند سے انھیں الفاظ کے ساتھ مروی نہیں ہوگی، اس کا تذکرہ خود امام مسلم رحمہ اللہ نے کتاب کے مقدمہ میں تفصیل سے کیا ہے، یہ خصوصیت دوسری کتب احادیث میں عام طور پر نہیں ملتی۔

نویں خصوصیت: امام مسلم نے سند حدیث میں راویوں کے اسماء کے ضبط کا بھی بڑا خیال رکھا ہے، اگر کسی راوی کا اصل سند میں صرف نام ذکر کیا گیا ہو اور نسب کا ذکر نہ ہو، جس کے سبب اکثر ابہام پیدا ہو جاتا ہے، امام مسلم رحمہ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہیں، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ استاذ کے بیان کئے ہوئے الفاظ میں خلل نہ آئے، مثلاً انھوں نے ایک سند بیان کی حدثنا سلیمان یعنی ابن بلال عن یحیٰی وھو ابن سعید، اس مقام پر

استاذ نے سلیمان بن بلال کا نام صرف سلیمان اور یحییٰ بن سعید کا نام صرف یحییٰ ذکر کیا تھا اوران کے نسب کو ظاہر نہیں کیا تھا، امام صاحب چاہتے تو اس کو سلیمان بن بلال اور یحیی بن سعید کے نام سے ذکر کر سکتے تھے لیکن اس صورت میں یہ وہم ہوتا کہ شاید استاذ نے اپنی سند میں ان کا ذکر اسی طرح سے کیا ہے، اس لئے امام صاحب نے اعلیٰ درجہ کی احتیاط کرتے ہوئے یہ تعبیر اختیار فرمائی، اسی طرح راوی کی کنیت اور صفت میں بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

دسویں خصوصیت: امام صاحب نے اپنی صحیح میں تعلیقات کو کم سے کم جگہ دی ہے، جب کہ امام بخاری علیہ الرحمہ کی صحیح میں تعلیقات کی کثرت ہے، حافظ ابن صلاح نے صحیح مسلم میں تعلیقات کی کل تعداد صرف چودہ (۱۴) بتائی ہے، جس کی فہرست بھی انھوں نے پیش کی ہے، حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں کہ یہ چودہ تعلیقات اگر چہ منقطع سند سے مروی ہیں لیکن یہ احادیث دوسری متصل سند سے بھی مروی ہیں، اس لئے یہ روایات بھی حکم صحیح اور موصول ہیں۔

یہ ہیں صحیح مسلم کی وہ چند خصوصیات وامتیازات جو اس کو دوسری تمام کتب احادیث سے ممتاز کرتی ہیں، یہاں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ مذکورہ بالا صفات وخصوصیات سرسری طور پر ذکر کی گئی ہیں، جبکہ امام مسلم رحمہ اللہ اوران کی صحیح کی خصوصیات وامتیازات اتنے ہیں کہ ان کا احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے، تاہم ان ہی خصوصیات وامتیازات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ صحیح مسلم حسن ترتیب اور احتیاط میں دنیا کی تمام کتابوں میں ممتاز اوران سب پر فائق ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام امت کی طرف سے امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کو جزاء خیر عطا فرمائے، ان کی قبر پر نور کی بارش فرمائے۔ فجزاه الله خير الجزاء.

شرائطِ مسلم

امام مسلم نے اپنی کتاب میں حدیث لکھنے کے لیے جن شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) وہ حدیث صحیح لذاتہ ہو۔

(۲) راویوں کے پانچ طبقہ میں سے صرف دو طبقہ کی روایت ہو، ہاں بطور متابعت تیسرے طبقہ کی ہو، تو الگ بات ہے۔

(۳) راوی کی ثقاہت پر اجماع ہو، یعنی انہیں راویوں کی روایت اخذ کریں گے، جن کی عدالت وضبط پر ائمہ حدیث کا اجماع ہو۔

(۴) راویٔ وحدان اور مجاہیل کی روایت نہ ہو، وحدان کا مطلب یہ ہے کہ وہ رواۃ جن سے صرف ایک راوی نے روایت کی ہو، امام حاکم مدخل میں لکھتے ہیں کہ امام کی نظر میں وہ حدیث ایسی ہو کہ کم از کم دو ثقہ تابعین، دو صحابی سے اس روایت کو بیان کریں، اور یہی شرط تمام طبقات یعنی تابعین، تبع تابعین میں ملحوظ ہو یہاں تک کہ سلسلۂ سند امام مسلم تک اسی طرح دو، دو سے روایت ہوتے ہوئے پہونچ جائے۔

(۵) وہ حدیث متفق الصحۃ ہو، یعنی مطلقاً صحیح نہیں بلکہ وہ صحیح روایت جن کی صحت پر مشائخ وقت کا اجماع ہو چکا ہو چنانچہ خود امام مسلم کا قول ہے "لَيْسَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدِيْ صَحِيْحٌ وَضَعْتُهُ هٰهُنَا إِنَّما وَضَعْتُ مَا اجْمَعُوْا عَلَيْهِ" م

(مقدمة مسلم)

شرائط مسلم پر چند اشکال

امام مسلم کی آخری تینوں شرطوں پر چند اشکالات، جو حسب ذیل ہیں:

(ا) ابھی تیسری شرط میں کہا گیا کہ اسی راوی کی روایت کو لیں گے جن کی ثقاہت پر اجماع ہو، حالانکہ اس شرط پر امام مسلم نہ رہ سکے، کیونکہ امام نسائی نے شیخین کے بعض راویوں کی تضعیف کی ہے، معلوم ہوا کہ وہ رجال متفق علیہ نہیں؟

جواب: جن راویوں کے حالات ائمہ جرح وتعدیل کے درمیان مختلف فیہ ہیں ان کی روایت کو مستقلا ذکر نہیں کیا، بلکہ محل استشہاد میں ذکر کیا ہے جو ان کی شرط کے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔

(ب) جن ضعیف راویوں کی روایات اس میں مذکور ہیں ان کا ضعف تغیر حافظہ کی بناء پر ہے جبکہ امام مسلمؒ نے تغیر حافظہ سے پہلے ان سے حدیث اخذ کی، گویا وجہ ضعف اخذ روایت کے بعد پیش آئی، اس لئے کوئی اشکال نہیں۔

(ج) ضعیف راوی سے مراد وہ راوی ہے جس کا ضعف مفسر بالسبب ہو، لیکن جن کا ضعف غیر مفسر ہو وہ قابل احتراز نہیں۔

(د) بسا اوقات کسی حدیث کو اس کی ضعیف سند سے اس بنا پر لاتے ہیں کہ دوسری قوی سند کے مقابلہ میں وہ سند عالی اور بلند ہوتی ہے، باوجود یہ کہ امام مسلمؒ کے نزدیک وہ اصل حدیث دیگر ثقہ وعمدہ راویوں کی روایت سے معروف ہوتی ہے۔

(۲) چوتھی شرط پر یہ اعتراض ہے کہ مسلم کی بعض روایت حقیقۃً وحدان راوی کی ہے مثلاً صحابہ میں سے "ربیعہ بن کعب اسلمی" کہ ان سے فقط ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن نے روایت کی ہے، اور غیر صحابہ میں زید بن ابی رباح، کہ ان سے فقط امام مالکؒ نے روایت کی ہے؟

جواب: کم از کم دو راوی کا ہونا یہ شرط صحابی کے لئے وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی

ہے "لأن الصحابة كلهم عدول".

البتہ غیر صحابہ میں رفع جہالت کے لیے دو یا دو سے زائد تلامذہ کا ہونا ضروری ہے، اور جن مواقع میں اس کے برخلاف مسلم میں راوی تنہا ہیں وہ نادر ہے "والنادر کالمعدوم" نیز ایسے ایک راوی کی کسی نہ کسی نے توثیق کی ہے۔

"إنما الأعمال بالنيات" بھی صرف ایک راوی حضرت عمرؓ سے مروی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شہرت طرق، ثبوت صحت نیز حصول برکت کی وجہ سے اپنی سابقہ شرط پر قائم نہ رہ سکے۔

طرزِ مسلم: امام مسلم امام بخاری کی طرح صحیح لذاتہ ذکر کرتے ہیں صحیح لذاتہ سے مراد وہ حدیث جس کے کل راوی عادل و کامل الضبط ہوں، سند متصل ہو، اور وہ معلل، شاذ اور منکر ہونے سے محفوظ ہو۔

سردِ روایت: یعنی وہ جزم وقوت کی زیادتی کے لیے احادیث مرفوعہ متصلہ صحیحہ کے متعدد طرق ذکر کرتے ہیں۔

مسلم کی اسانید: مسلم کی سب سے عالی سند رباعی ہے، رباعی کا مطلب یہ ہے کہ جس میں راوی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف چار واسطے ہوں، ایک قول کے مطابق اس میں رباعی احادیث اسّی (۸۰) ہیں، جبکہ بخاری شریف کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ بخاری شریف میں ۲۲/ثلاثیات ہیں۔

تراجم مسلم: آپ نے خود ترجمۃ الباب قائم نہیں کیا، لیکن امام نووی فرماتے ہیں کہ امام مسلم نے اپنی کتاب کو ابواب کا لحاظ کرتے ہوئے مرتب کیا ہے، لیکن ترجمہ یا تو اس لئے چھوڑ دیا کہ کتاب ضخیم ہو جائے گی یا کسی اور پر، بعد میں بہت سے شارحین حدیث نے ابواب قائم کئے لیکن حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ مصنف اول کتاب کے شایان شان اب تک تراجم قائم نہ ہو سکے۔

کیا مسلم کی سبھی حدیثیں صحیح ہیں

بخاری شریف ہو یا صحیح مسلم ان دونوں کے بارے میں بھی کلام ہوا ہے، کیا ان میں کی تمام حدیثیں واقعۃً صحیح ہیں؟

اس سلسلہ میں دار قطنی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صحیحین کی دو سو دس احادیث صحیح نہیں جن میں بتیس تو ان دونوں میں موجود ہیں اور اٹھہتر بخاری میں اور سو مسلم میں۔

امام طحاوی نے بھی صحیحین کی بعض احادیث پر کلام کیا ہے، مثلاً تورک کے باب میں حضرت ابوحمید ساعدی کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے جب کہ وہ صحیحین میں موجود ہے۔

اسی طرح حافظ عبدالقادر قرشی نے اپنی کتاب طبقات میں اس کلیۃ کا انکار کیا ہے کہ ان دونوں کی ہر حدیث صحیح ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے ھدی الساری مقدمہ فتح الباری میں دار قطنی کے ہر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی احادیث بے غبار اور صحیح ہیں۔

مسلم میں کس قسم کی روایت ہے؟

امام مسلم نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حدیث کی تین قسمیں ہیں، جن کو میں ذکر کروں گا۔

(۱) جس کا راوی حفظ واتقان، ضبط وعدالت میں اعلیٰ درجہ کا ہو۔

(۲) جس کے راوی کا حفظ واتقان متوسط درجہ کا ہو۔

(۳) جس کا راوی ضعیف ہو، اور ان کی روایت متروک نہ ہو۔

امام مسلم کی اس تقسیم حدیث کے بعد محدثین کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہو گیا کہ امام مسلم نے اپنے اس وعدہ کو پورا کرتے ہوئے تینوں طرح کی روایت ذکر کی ہے یا نہیں؟

حاکم ابوعبید اللہ امام بیہقی، ابن عساکر کا خیال ہے کہ درحقیقت امام مسلم نے ان تینوں قسم کی احادیث الگ الگ کتاب میں جمع کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، البتہ ابھی صحیح مسلم میں صرف طبقۂ اولیٰ ہی کی احادیث جمع کر پائے تھے کہ عمر نے وفا نہیں کی اور دوسرے اور تیسرے طبقہ کی روایات الگ الگ کتاب میں جمع کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا، اسی بنا پر حاکم فرماتے ہیں:

"قَدْ أَرَادَ مُسْلِمٌ أَنْ يُخْرِجَ الصَّحِيْحَ عَلىٰ ثَلٰثَةِ أَقْسَامٍ فِي الرُّوَاةِ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ هٰذَا الْقِسْمِ الْأَوَّلِ أَدْرَكَتْهُ الْمَنِيَّةُ وَهُوَ فِي حَدِّ الْكُهُوْلَةِ".

(المدخل ص:۷)

غرض ان حضرات کے بقول، مسلم شریف میں صرف پہلے طبقہ کی روایات ہیں، مگر قاضی عیاضؒ اور دیگر علماء نے مذکورہ توجیہ کو پسند نہیں کیا، بلکہ اسکی تردید کردی ہے کہ مسلم شریف بغور مطالعہ کرنے سے یقین ہوتا ہے کہ مسلم میں صرف پہلی قسم کی نہیں بلکہ دوسری اور تیسری قسم کی روایات بھی ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ پہلے پہلی قسم کو ذکر کرتے ہیں اسکے بعد متابعت اور شواہد کے طور پر ان کی روایات ہوں گی جو متوسط درجہ کے ہوں، اس طبقہ کو پہلے طبقہ کے ساتھ ملحق کیا ہے، اس کے بعد تیسرے طبقہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ان کا ضعف متفق علیہ ہے تو پھر ان کی روایت ذکر نہیں کی ہاں جن کے بارے میں کلام ہوا، اور اکثر محدثین نے تزکیہ وتعدیل کی ہے ان کی بھی روایت ذکر کی ہیں، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے جس کو تیسرا طبقہ کہا ہے ان کی احادیث بہت تھوڑی مقدار میں مذکور ہیں، وہ بھی بطور متابعت، ورنہ تو اگر اس کا استقصا کرتے تو کتاب کافی ضخیم ہوجاتی اور درجہ صحت سے گر جاتی، غرض امام حاکم کا یہ کہنا کہ ایک ہی قسم کی روایات ہیں اور دوسری، تیسری قسم کی روایات کیلئے کتاب لکھنے کا ارادہ تھا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

(تدریب الراوی ص ۹۶/۱)

مسلم میں ضعیف راوی کی روایت

قاضی عیاض اور علامہ ذہبی کے بقول امام مسلم پر اعتراض ہوتا ہے کہ جب مسلم میں صحیح روایتوں کے نقل کرنے کا التزام کیا ہے تو پھر مستور الحال، اور ضعفاء کی روایت کیسے نقل کر دی؟ کیونکہ یہ دونوں قسم کے راوی صحیح کے راوی نہیں، محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں:

(۱) ابو عمرو بن صلاح فرماتے ہیں جن ضعفاء کی روایت نقل کی ہیں، یہ وہ ضعیف راوی ہیں جن پر اوروں نے تو کلام کیا لیکن خود امام مسلم کے نزدیک وہ ضعیف نہیں، لیکن اس جواب پر اشکال ہوتا ہے کہ اس کے باوجود مسلم میں ایسی کوئی روایت درج نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اصول حدیثیت کا مسئلہ ہے۔

الجرح مقدم علی التعدیل

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس اصول کا تعلق جرح مفسر سے ہے، اگر جرح مبہم ہو تو پھر اس جرح کا کوئی اعتبار نہیں۔

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ جن ضعفاء کی روایت بخاری، مسلم، ابوداؤد میں ہیں، یہ وہی ضعیف و مجروح راوی ہیں جن پر جرح مبہم ہوا ہے، جرح مبہم کا مطلب یہ ہے کہ جرح کی کوئی معقول وجہ نہ ذکر کی گئی ہو۔

علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ جن ائمہ کی امامت اور جلالت شان امت میں مسلم ہے ان پر جرح مبہم قابل اعتبار نہیں، اگر ہر شخص کے تعلق سے جرح مبہم معتبر مان لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھی کلام سے خالی نہ مانا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ پر دار قطنی نے جرح کیا، امام شافعی پر یحیٰ بن معین نے، امام احمد پر

کرابیسی نے، امام بخاری پر ذہلی نے، امام اوزاعی پر امام احمد نے، ابن حزم نے ترمذی اور ابن ماجہ پر، امام نسائی پر تشیع کا الزام، غرض اس طرح کے جرح کا اعتبار کیا جائے تو ان میں سے کوئی ثقہ باقی نہ رہ جائے گا۔

حدیث عنعنہ میں شیخین کا اختلاف

حدیث کی روایت کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کہیں "حدثنا فلان" کہیں "أخبرنا فلان" کہیں "سمعت عن فلان" اور کہیں "فلان عن فلان" کے ذریعہ بیان کرتے ہیں جس حدیث کو "عن عن" کے ذریعہ بیان کیا جائے اس حدیث کو حدیث معنعن کہا جاتا ہے، اور اس طرح روایت کرنے والے کو معنعن کہا جاتا ہے، بیان روایت کے وقت راوی اگر "حدثنی"، "حدثنا"، "أخبرنی"، "أخبرنا"، اور "سمعت کے الفاظ کہے تو صراحت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ راوی نے مروی عنہ سے سنا ہے لیکن اگر حدیث کی روایت "عن فلان عن فلان" کے ذریعہ ہو تو بصراحت معلوم نہیں ہوتا کہ راوی نے براہِ راست مروی عنہ سے سنا ہے یا نہیں؟

اب اس معنعن روایت کو کس صورت میں اتصال پر محمول کیا جائے، اور کس صورت میں انقطاع پر؟ تو اس سلسلہ میں معیار یہ ہے کہ اس کی تین صورت ہے۔

(۱) غیر مدلس، معنعن راوی کا اس کے مروی عنہ سے لقاء وسماع ثابت ہو۔

(۲) غیر مدلس، معنعن راوی کا اس کے مروی عنہ سے عدمِ لقاء، عدمِ سماع معروف ومتیقن ہو۔

(۳) غیر مدلس معنعن راوی کا اپنے معاصر راوی سے نہ تو لقاء وسماع کا ثبوت ہو اور نہ عدم لقاء وعدم سماع کا ثبوت ہو بلکہ دونوں پہلو مخفی ہوں۔

اس میں پہلی صورت بالاتفاق سند متصل کہلاتی ہے، اور دوسری صورت بالاتفاق

حدیث کو حدیث منقطع بنا دیتی ہے، تیسری صورت میں علماء باہم مختلف ہیں، حضرت امام بخاریؒ، علی ابن مدینی، ابو بکر الصیرفی کے نزدیک ایسی روایت منقطع غیر صحیح ہے، ان حضرات کے یہاں صیغۂ عن کی روایت کے متصل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ راوی کا مروی عنہ سے کم از کم ایک دفعہ لقاء یا سماع یقینی طور پر ثابت ہو۔

ابو مظفر سمعانی کا یہ کہنا ہے کہ روایت عنعنہ اس وقت مقبول ہوگی جب کہ راوی مروی عنہ کے ساتھ ایک زمانہ دراز تک رہ چکا ہو۔

اس مسئلہ پر امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ

نام ونسب: نام نامی مسلم، کنیت ابوالحسین، لقب عساکر الدین، والد ماجد کا نام حجاج، دادا کا نام مسلم پردادا کا نام ورد، اور جداعلیٰ کا نام کوشاد ہے، وطنی نسبت نیشاپوری اور خاندانی نسبت قشیری ہے، قشیر عرب کا مشہور قبیلہ ہے، مگر امام مسلم غالباً عجمی ہیں، اور قبیلہ قشیر کی طرف ان کی نسبت غالباً ولاء کی بنا پر ہے جس طرح امام بخاری کی نسبت جعفی ولاء کی بناپر ہے، قال الذهبی لعله من موالی قشیر۔

(سیر اعلام النبلاء ج ۱۲ ص ۵۵۷)

ولادت: علامہ ذہبی کی تحقیق کے مطابق امام مسلم ۲۰۴ھ مطابق ۸۳۰ء میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے، بعضوں نے سن پیدائش ۲۰۲ھ اور بعضوں نے ۲۰۶ھ بتایا ہے، ابن اثیر اور خلکان نے ۲۰۶ھ والے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

سماع حدیث کے لئے سفر: امام مسلم نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ہر چہار جانب علم حدیث کا غلغلہ تھا، خوش قسمتی سے نیشاپور کو اس میں مرکزیت حاصل تھی، بقول علامہ ذہبی، امام مسلم نے ۲۱۸ھ میں سماع حدیث کی ابتداء کی، گویا چودہ برس کی عمر سے سماع حدیث کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، امام موصوف کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہو سکے لیکن خراسان اور نیشاپور میں اسحاق بن راہویہ، اور امام ذہلی جیسے ائمہ فن موجود تھے، ان سے سماع حدیث کے علاوہ، عراق، حجاز، شام، مصر اور بغداد وغیرہ متعدد بار جا کر وہاں کے علماء ومشائخ سے امام موصوف نے علم حدیث حاصل کیا۔

اساتذہ: آپ کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، صحیح مسلم میں جن اساتذہ کی روایتیں

درج فرمائی ہیں ان کی تعداد (۲۲۰) ہے، چند اساتذہ کے نام یہ ہیں (۱) امام احمد بن حنبل (۲) اسحاق بن راہویہ (۳) امام ذہلی (۴) عبداللہ بن مسلمہ قعنبی، مکہ مکرمہ میں یہی امام مسلم کے سب سے پہلے استاد حدیث ہیں (۵) امام ذہلی آپ کے استاد ضرور ہیں مگر ان کی سند سے کوئی حدیث آپ نے مسلم شریف میں درج نہیں کی ہے البتہ آپ کے شاگرد اور مسلم شریف کے راوی ابواسحاق نے مقدمہ مسلم میں ایک حدیث امام ذہلی کی سند سے ذکر کی ہے، (۶) امام بخاری کے نیشاپور آنے پر ان کی شاگردی اختیار کی اور نہایت عقیدت کا ثبوت دیا لیکن امام بخاری کی سند سے بھی کوئی حدیث صحیح مسلم میں ذکر نہیں کی۔

تلامذہ: چند مشہور تلامذہ یہ ہیں (۱) امام ترمذی (۲) صالح بن محمد جزار (۳) ابن ابی حاتم (۴) امام ابن خزیمہ (۵) حافظ ابوعوانہ وغیرہ، امام ترمذی نے آپ کی سند سے ترمذی میں ایک حدیث ذکر کی ہے۔

اعتراف فضل وکمال: امام موصوف کے زمانہ میں بہت سے ائمہ فن پیدا ہو چکے تھے جن میں سے کئی ایک کو امام موصوف کے استاذ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ نے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا، چنانچہ اسحاق بن راہویہ امام فن آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں "أَيُّ رَجُلٍ يَكُوْنُ هٰذَا" یہ شخص کس مقام پر پہونچے گا کچھ نہیں کہا جاسکتا، حافظ ذہبی نے آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے "هُوَ الْإِمَامُ الْكَبِيْرُ الْحَافِظُ الْمُجَوِّدُ الْحُجَّةُ الصَّادِقُ"۔

امام مسلم کا مسلک: علامہ انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام مسلم وابن ماجہ کا مسلک واضح طریقہ سے معلوم نہیں ہوسکا، شیخ عبداللطیف سندھی فرماتے ہیں کہ امام ترمذی ومسلم کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ امام شافعیؒ کے مقلد ہیں حالاں کہ یہ دونوں مجتہد تھے، البتہ بہت سے مسائل میں ان سے استفادہ کیا ہے، مولانا عبدالرشید نعمانی کی تحقیق یہ ہے کہ امام مسلم مالکی المسلک تھے، مگر طبقات المالکیہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے،

صاحب الیانع الجنی نے امام مسلم کے سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ اصولی طور پر شافعی تھے، انہوں نے امام شافعی سے بہت کم اختلاف کیا ہے، شیخ طاہر جزائری کی رائے بھی امام مسلم کے متعلق یہی ہے کہ وہ کسی امام کے مقلد محض نہیں تھے البتہ امام شافعی وغیرہ اہل حجاز کے مسلک کی طرف مائل تھے۔

اخلاق وعادات اور زہد وتقویٰ: پوری زندگی میں نہ کسی کی غیبت کی نہ کسی کو مارا پیٹا، اپنے اساتذہ وشیوخ کا بے حد احترام فرماتے تھے، امام صاحب نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے، جس کام کو بھی کرتے بڑے ہی اخلاص سے کرتے تھے، ریا ونمود کا ان کے وہاں کوئی گذر نہیں تھا۔

تصانیف: مسلم شریف کے علاوہ تقریباً بیس اور کتابیں آپ نے تصنیف کیں، مگر آپ کا زندۂ جاوید کارنامہ مسلم شریف ہی ہے، بقیہ کتابوں کے نام یہ ہیں (۱) المسند الکبیر (۲) الأسماء والکنیٰ (۳) جامع کبیر (٤) کتاب العلل (٥) کتاب التمییز، (٦) کتاب الأقران (۷) کتاب أولاد الصحابه (۸) کتاب أوهام المحدثین (۹) کتاب من لیس له إلا راو واحد (۱۰) کتاب طبقات التابعین (۱۱) کتاب المخضرمین (۱۲) کتاب رواة الاعتبار (۱۳) کتاب أفراد الشامیین (۱٤) کتاب مشائخ مالك (۱٥) کتاب مشائخ شعبه (۱٦) کتاب مشائخ الثوری وغیرہ۔

وفات: امام مسلم کی وفات کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے، واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کو ایک حدیث کی تلاش تھی، آپ اس میں منہمک تھے اور سامنے کھجوروں کا ایک ٹوکرا رکھا ہوا تھا، حدیث کو تلاش کرتے رہے اور کھجوروں کو ٹوکرے سے نکال نکال کر کھاتے رہے، شدت انہماک کی وجہ سے پتہ نہ چل سکا یہاں تک کہ پورا ٹوکرا خالی ہوگیا، اُدھر ٹوکرا خالی ہوا ادھر حدیث مل گئی لیکن مقدار سے بہت زیادہ کھالینے کی بنا پر بظاہر یہی موت کا سبب بنا، چنانچہ ۲٦۱ھ اتوار کی شام آپ کا انتقال ہوگیا اور دوشنبہ کے دن نیشاپور میں دفن کئے گئے، کل عمر ٥۷ برس ہوئی۔

(باب)

صحیح مسلم کی بعض احادیث کی تخریج

حدیث نمبر:۱

قال الإمام مسلم فی کتاب الإیمان من صحیحه:

حدثنا ابو بکر بن ابی شیبة وابو کریب وإسحاق بن إبراهیم جمیعًا عن وکیع قال ابو بکر: حدثنا وکیع عن زکریا بن إسحاق قال: حدثنی یحیی بن عبد الله بن صیفی عن ابی معبد عن ابن عباس عن معاذ بن جبل قال ابو بکر ربما قال وکیع عن ابن عباس انَّ معاذاً قال: بَعَثَنِی رَسولُ اللهِ ﷺ، قالَ: إنَّكَ تَأْتی قَوْمًا مِن أهْلِ الكِتابِ، فادْعُهُمْ إلى شَهادَةِ أنْ لا إلَهَ إلّا اللَّهُ وأنِّی رَسُولُ اللهِ، فإنْ هُمْ أطاعُوا لذلكَ، فأعْلِمْهُمْ أنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عليهم خَمْسَ صَلَواتٍ فی كُلِّ يَومٍ ولَيْلَةٍ، فإنْ هُمْ أطاعُوا لذلكَ، فأعْلِمْهُمْ أنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عليهم صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِن أغْنِيائِهِمْ فَتُرَدُّ فی فُقَرائِهِمْ، فإنْ هُمْ أطاعُوا لذلكَ، فإيّاكَ وكَرائِمَ أمْوالِهِمْ، واتَّقِ دَعْوَةَ المَظْلُومِ، فإنَّه ليسَ بيْنَها وبيْنَ اللهِ حِجابٌ.

(رقم الحدیث ۱۹)

ترجمہ: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یمن کی طرف حاکم بنا کر) بھیجا تو فرمایا: ''تم ملو گے اہل کتاب کے کچھ لوگوں سے تو بلانا ان کو اس بات کی گواہی کی طرف کہ کوئی معبود برحق نہیں سوا اللہ کے اور میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم)، اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کو یہ بات بتلانا کہ اللہ نے ہر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کو یہ بات بتلانا کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی پھر انہی کے فقیروں اور محتاجوں کو دی جائے گی، اگر وہ اس بات کو مان لیں تو خبردار نہ لینا عمدہ مال ان کے (یعنی زکوٰۃ میں متوسط جانور لینا، عمدہ دودھ والا اور پر گوشت فربہ چھانٹ کر نہ لینا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی روک نہیں ہے۔

تخریج:

یہ حدیث امام مسلم نے کئی طرق سے نقل فرمائی ہے، ایک طریق اوپر گزرا، باقی طرق مندرجہ ذیل ہیں:

حدثنا ابن أبی عمر حدثنا بشر بن السری حدثنا زکریا بن إسحاق (ح) وحدثنا عبد بن حمید حدثناأبو عاصم عن زکریا بن إسحاق عن یحیی بن عبد اللّٰه بن صیفی عن أبی معبد عن ابن عباس: أنَّ النبی بعث معاذاً إلی الیمن فقال: ((إنك ستاتی قوماً...))، بمثل حدیث وکیع.

حدثنا امیة بن بسطام العیشی حدثنا یزید بن زریع حدثنا روح وهو ابن القاسم عن إسماعیل بن امیة عن یحیی بن عبد اللّٰه بن صیفی عن أبی معبد عن ابن عباس أنَّ رسول اللّٰه بعث معاذاً إلی الیمن قال: إنَّكَ تَقْدَمُ علی قَوْمٍ أهْلِ کِتابٍ، فَلْیَکُنْ أوَّلَ ما تَدْعُوهُمْ إلَیْهِ عِبادَةُ اللّٰهِ عزَّ وجلَّ، فإذا عَرَفُوا اللّٰهَ، فأخْبِرْهُمْ أنَّ اللّٰه فَرَضَ علیهم خَمْسَ صَلَواتٍ فی یَومِهِمْ ولَیْلَتِهِمْ، فإذا فَعَلُوا، فأخْبِرْهُمْ أنَّ اللّٰهَ قدْ فَرَضَ علیهم زَکاةً تُؤْخَذُ مِن أغْنِیائِهِمْ فَتُرَدُّ علی فُقَرائِهِمْ، فإذا أطاعُوا بها، فَخُذْ منهمْ وتَوَقَّ کَرائِمَ أمْوالِهِمْ.(رقم الحدیث ۱۹)

امام بخاری نے اس کو سات طرق سے الفاظ کے فرق کے ساتھ مختلف ابواب میں نقل فرمایا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱: کتاب الزکاة: حدثنا أبو عاصم الضحاك بن مخلد عن زکریا بن إسحاق عن یحیی بن عبد اللّٰه بن صیفی عن ابی معبد عن ابن عباس: انَّ النبی بعث معاذاً إلی الیمن فقال: ((ادعهم إلی شهادة ان لا إله إلّا اللّٰه وأنی رسول اللّٰه، فإن هم أطاعوا لذلك فأعلمهم أن اللّٰه افترض علیهم خمس صلوات فی کل یوم ولیلة، فإن هم أطاعوا لذلك فأعلمهم أن اللّٰه افترض علیهم صدقة فی

أموالهم تؤخذ من أغنيائهم وترد على فقرائهم)).

۲- (كتاب الزكاة) فى (باب لا تؤخذ كرائم أموال الناس فى الصدقة)۔

۳- (كتاب الزكاة) أيضاً فى (باب أخذ الصدقة من الأغنياء وترد فى الفقراء حيث كانوا)

٤- (كتاب المظالم، باب الاتقاء والحذر من دعوة المظلوم) .

٥- (كتاب المغازى) فى (باب بعث أبى موسى ومعاذ إلى اليمن قبل (حجة الوداع)عن شيخه حبان بن موسى عن عبد الله بن المبارك عن زكريا بن إسحاق

٦ و ۷- (كتاب التوحيد) (باب ما جاء فى دعاء النبى أمته إلى توحيد الله تبارك وتعالى).

نیز یہ حدیث مندرجہ ذیل مصادر میں بھی موجود ہے:

أبو داود (كتاب الزكاة) (باب فى زكاة السائمة)

ترمذی (كتاب الزكاة،باب كراهية أخذ خيار المال فى الصدقة) وقال: قال أبو عيسى: وفى الباب عن أنس وأبى هريرة وعبد الله بن عمر وأبى سعيد، وهذا حديث حسن صحيح وأبو معبد اسمه نافذ. انتهى.نسائى (كتاب الزكاة)

ابن ماجه (كتاب الزكاة، باب فرض الزكاة)

صحابی کے متعلق:

۱: حضرت معاذ بن جبل رضى الله عنه

*آپ کا اسم گرامی معاذ بن جبل بن عمرو ہے اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔نسب نامہ یہ ہے:*معاذ بن جبل بن عمرو بن أوس بن عائذ بن عدى بن كعب بن عمرو بن أدى بن على بن أسد أبوعبدالرحمن الأنصارى الخزرجى.

(الإصابه فى تمييز الصحابه: ج۳ص۱۸٤۷،رقم الترجمة: ۸۰٤۰)

قبول اسلام:

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا تعلق مدینہ منورہ سے تھا، اس لیے جب مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آپ نے اسلام قبول کرلیا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حلال وحرام کا سب سے زیادہ جاننے والا قرار دیا ہے۔فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

أعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل.

(جامع الترمذی: ج۲ ص۲۱۹ باب مناقب معاذ بن جبل رضی اللّٰہ عنہ)

یعنی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ میری امت میں حلال وحرام کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں اور جس فن میں حلال وحرام کے احکامات بیان کئے جائیں اسے ''علم فقہ'' کہتے ہیں، تو گویا آپ علیہ السلام نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فقہ کا بڑا ماہر قرار دیا۔

وفات حسرت آیات:

۱۸ھ میں ۳۶ سال کی انتہائی کم عمری میں فقہ واجتہاد کا یہ نامور سپوت دنیائے فانی چھوڑ کر دنیائے باقی کی طرف رخصت ہوگیا۔فرضی اللہ عنہ۔

۲- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فضل وکمال کے اعتبار سے اپنے زمانے کے صف اول کے علماء میں سے تھے جن کی ذات گرامی ایسا صحیفہ تھی جس میں تمام علوم ومعارف جمع تھے، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، شعروشاعری، فرائض اور مغازی وغیرہ، کوئی ایسا علم نہ تھا جس میں سے اللہ تعالیٰ نے ان کو حظِ وافر عطا نہ فرمایا ہو، بالخصوص کلام اللہ کی تفسیر وتاویل میں جو مہارت اور آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول اور ناسخ ومنسوخ کے علم میں جو وسعت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی شاید کسی کے حصہ میں آئی ہو۔

نماز جنازہ اور تدفین:

آخر کار علم وعمل کا یہ پیکر، حبر الامۃ، ابن عم رسول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ

عنہما ۶۸ ہجری دار فانی سے دارِ باقی کی طرف تشریف لے گئے۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین کے بعد فرمایا

"اليوم مات ربانی هذه الأمة"(سير أعلام النبلاء ج:٤ ص:١٨٠)

کہ آج اس امت کا ایک ربانی عالم دنیا سے رخصت ہوگیا۔

سندی نکات:

(۱) سلسلۂ اسناد کے تمام راوی صحاح ستہ کے ہیں، سوائے امام مسلم کے شیخ ابوبکر بن ابی شیبہ کے، جن کی حدیث کو ترمذی نے روایت نہیں کیا۔ اور ان کے شیخ اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ کے جن کی حدیث ابن ماجہ میں نہیں ہے۔

(۲) راویوں کے سلسلہ میں تین کوفی ہیں: ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوکریب اور وکیع، اور چار مکی ہیں: زکریا بن اسحاق، یحییٰ بن عبداللہ بن صیفی، ابومعبد اور ابن عباس۔

(۳) راویوں کے سلسلے میں ایک راوی ایسے ہیں جنہیں حدیث میں امیر المؤمنین کہا گیا ہے اور وہ ہیں: اسحاق بن راہویہ، احمد بن حنبل نے انہیں اس خطاب سے نوازا ہے۔

(۴) راویوں کے سلسلہ میں تین ایسے ہیں جو اپنی کنیتوں سے مشہور ہیں: ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوکریب محمد بن العلاء اور ابومعبد مولی ابن عباس۔

(۵) راویوں کے سلسلہ میں دو صحابی ہیں: ابن عباس اور معاذ۔

تشریح:

حدیث سے مندرجہ ذیل امور اخذ کئے جاسکتے ہیں:

(۱) مبلغین بھیجنے کا ثبوت۔

(۲) دعوت دینے والوں کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا۔

(۳) داعیوں کو مدعوین کے حالات سے آگاہ کرنا تاکہ اسی کے مطابق تیاری کریں اور ان سے ملاقات سے پہلے اپنا ذہن بنالیں۔

(۴) مبلغ اور استاد رفتہ رفتہ تبلیغ وتدریس کا کام کریں۔

(۵) دین میں سب سے پہلی اور بنیادی چیز اس بات کی گواہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

(۶) اہم امور کو مقدم کرنا۔

(۷) اسلام میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں شہادتیں ایک ساتھ ادا کریں۔

(۸) لڑائی سے پہلے توحید کی دعوت دینا۔

(۹) دین اسلام کی بنیاد خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغمبر کی رسالت کا اقرار ہے۔

(۱۰) نماز کی اہمیت کی وضاحت اور یہ کہ یہ دو شہادتوں کے بعد اسلام کا سب سے بڑا ستون ہے۔

(۱۱) پنجگانہ نمازیں ہر دن اور رات میں فرض ہیں۔

(۱۲) زکوٰۃ لینے کے لیے کارکن بھیجنا۔

(۱۳) امام کا اپنے کارکنوں کو وعظ کرنا، اور انہیں خدا سے ڈرنے اور ظلم سے بچنے کی تنبیہ کرنا

(۱۴) زکوٰۃ کی صحیح جگہوں پر ادائیگی امام یا اس کے نمائندے کے سپرد ہے۔

(۱۵) اگر مالدار زکوٰۃ ادا نہ کرے تو زبردستی اس سے لی جائے گی۔

(۱۶) زکوٰۃ کافر کو نہیں دی جائے گی۔

(۱۷) ایک طبقے کو زکوٰۃ دینے کی اجازت۔

(۱۸) امیر اور غریب کے درمیان فرق کی طرف اشارہ، اور یہ کہ امیر وہ ہے جس سے زکوٰۃ لی جاتی ہے، اور غریب وہ ہے جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے۔

(۱۹) مالک کی رضامندی کے بغیر صدقہ لینے میں اچھی چیز اختیار کرنا حرام ہے۔

(۲۰) ہر قسم کی ناانصافی سے بچنے کی تنبیہ۔

(۲۱) ظلم کی حرمت اور اس کے سنگین نتائج کی وضاحت۔

(۲۲) جس پر ظلم ہوا ہو، اسے حق ہے کہ ظالم پر بددعا کرے۔

(۲۳) مظلوم کی دعا قبول ہوتی ہے۔

حدیث نمبر۲

قال الإمام مسلم رحمه الله فی کتاب الإیمان من صحیحه:

وحدثنی حرملة بن یحیی التجیبی أخبرنا عبد الله بن وهب، قال أخبرنی یونس عن ابن شهاب قال: أخبرنی سعید بن المسیب عن أبیه قال: لما حضرت أبا طالب الوفاة جائه رسول الله صلی الله علیه وسلم فوجد عنده أبا جهل وعبد الله بن أبی أمیة بن المغیرة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ((یا عمّ قل: لا إله إلّا الله کلمة أشهد لك بها عند الله))، فقال أبو جهل وعبد الله بن أبی أمیة: یا أبا طالب أترغب عن ملّة عبد المطلب .فلم یزل رسول الله صلی الله علیه وسلم یعرضها علیه ویعید له تلك المقالة حتی قال أبو طالب آخر ما کلمهم: هو علی ملّة عبد المطلب. وأبی أن یقول: لا إله إلّا الله، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ((أما والله لأستغفرن لك ما لم أنهَ عنك)). فأنزل الله عزوجل:(مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَن يَسْتَغْفِرُواْ لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُواْ أُوْلِي قُرْبَى مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ) التوبة:۱۱۳، وأنزل الله تعالی فی أبی طالب فقال لرسول الله صلی الله علیه وسلم: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ.

ترجمہ:

سعید بن مسیّب (جو مشہور تابعین میں سے ہیں۔ابن مدینی نے کہا: میں نے ان سے زیادہ علم میں کوئی تابعی نہیں پایا، فقیہ ہیں، امام ہیں) روایت کرتے ہیں اپنے باپ سے (مسیّب بن جزن بن عمرو بن عابد بن عمران بن مخزوم سے جو صحابی ہیں) انہوں نے کہا: جب ابوطالب بن عبدالمطلب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا اور پرورش کرنے والے) مرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور وہاں ابوجہل (عمرو بن ہشام) اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ کو بیٹھا دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے چچا میرے! تم کہہ لو "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ" ایک کلمہ میں اللہ کے پاس اس کا گواہ رہوں گا تمہارے لئے،'' (یعنی اللہ عزوجل سے قیامت کے روز عرض کروں گا کہ ابوطالب موحد تھے اور ان کو جہنم سے نجات ہونی چاہئے اس لئے کہ انہوں نے آخر وقت میں کلمہ توحید کا اقرار کیا تھا) ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بولے: اے ابوطالب! عبدالمطلب کا دین چھوڑتے ہو؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر یہی بات ان سے کہتے رہے (یعنی کلمہ توحید پڑھنے کے لئے، ادھر ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ اپنی بات بکتے رہے) یہاں تک کہ ابوطالب نے اخیر بات جو کی وہ یہ تھی کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں اور انکار کیا "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہنے سے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم اللہ کی میں تمہارے لئے دعا کروں گا (بخشش کی) جب تک منع نہ ہو، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾ یعنی ''نبی کو اور مسلمانوں کو درست نہیں کہ مشرکوں کے لئے دعا کریں اگرچہ وہ ناطے والے ہوں جب معلوم ہو گیا کہ وہ جہنمی ہیں۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے ابوطالب کے بارے میں یہ آیت اتاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ یعنی ''تم راہ پر نہیں لا سکتے جس کو چاہو لیکن اللہ راہ پر لا سکتا ہے جس کو چاہے اور وہ جانتا ہے ان لوگوں کو جن کی قسمت میں ہدایت ہے۔

تخریج:

امام مسلم نے اس حدیث کو متعدد طرق سے نقل کیا ہے، ایک طریق اوپر گزرا، دیگر ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں:

۱- حدثنا إسحاق بن إبراهيم وعبد بن حميد قالا أخبرنا عبد الرزاق أخبرنا معمر (ح)، وحدثنا حسن الحلواني وعبد بن حميد قالا حدثنا يعقوب وهو ابن إبراهيم بن سعد قال: حدثني أبي عن صالح كلاهما عن الزهري بهذا

الإسناد مثله غير أن حديث صالح انتهى عند قوله: فأنزل الله عزوجل فيه ولم يذكر الآيتين وقال في حديثه: ويعودان في تلك المقالة وفي حديث معمر مكان هذه الكلمة فلم يزالا به.

۲- حدثنا محمد بن عباد وابن أبي عمر قالا حدثنا مروان عن يزيد وهو ابن كيسان عن أبي حازم عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعمه عند الموت: ((قل: لا إله إلّا الله، أشهد لك بها يوم القيامة))، فأبى، فأنزل الله إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ) الآية.

۳- حدثنا محمد بن حاتم بن ميمون حدثنا يحيى بن سعيد حدثنا يزيد بن كيسان عن أبي حازم الأشجعي عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعمه: ((قل: لا إله إلّا الله أشهد لك بها يوم القيامة))، قال: لولا أن تعيرني قريش يقولون إنما حمله على ذلك الجزع، لأقررت بها عينك. فأنزل الله (إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ).

امام بخاری نے اس کو پانچ جگہ نقل فرمایا ہے:

۱- (كتاب الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت لا إله إلّا الله)

۲- باب قصة أبي طالب

۳- في تفسير سورة البراءة، باب ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ﴾

۴- في تفسير سورة القصص، باب: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾

(۵) (كتاب الأيمان والنذور، باب إذا قال: والله لا أتكلم اليوم فصلى أو قرأ أو سبح أو كبر أو حمد أو هلل فهو على نيته)

امام نسائی نے اس کو (كتاب الجنائز) النهي عن الاستغفار للمشركين **میں نقل فرمایا ہے۔**

امام ترمذی نے سورۃ القصص کی تفسیر میں اس کی تخریج کی ہے۔

صحابی کے متعلق:

المسيب بُن حزن بُن أبِى وهب بُن عَمْرو بُن عائذ بُن عمران بُن مخزوم القرشي المخزومي۔

ان کا لقب ابو سعد تھا، اور وہ سعید بن المسیب کے والد ہیں جو مشہور فقیہ ہیں، اور جن کا شمار مدینہ کے سات فقہائے تابعین میں ہوتا ہے۔

اپنے والد حزن کے ساتھ مدینے کی طرف ہجرت کی اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت رضوان کی، یرموک کی جنگ میں شرکت کی، ان کے بیٹے سعید بن المسیب نے ان سے روایت کی ہے۔

اس حدیث سے درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) کسی مشرک رشتہ دار کی عیادت اور ملاقات کی اجازت۔

(۲) مرتے وقت کافر کے سامنے اسلام پیش کرنا مستحب ہے۔

(۳) کفار کو ہدایت کی امید میں حق کی گواہی دینے کی بار بار تلقین کرنا۔

(۴) توبہ اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک کہ موت اس کے پاس نہ آئے۔

(۵) اگر کافر حق کی گواہی دے گا تو وہ عذاب سے محفوظ رہے گا کیوں کہ اسلام اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

(۶) خدا کی طرف بلانے کا جذبہ۔

(۷) اپنے چچا ابو طالب کی ہدایت کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید خواہش اور بے چینی۔

(۸) اہل باطل نے دعوت حق کی مخالفت آخری دم تک کی ہے۔

(۹) رشتہ داروں کو مخاطب کرنے میں نرمی، اوران کو حکمت کے ساتھ دعوت دینا۔

(۱۰) انسان پر برے دوستوں کے برے اثرات اور سنگین نتائج۔

(۱۱) نجات کے لئے توحید کا کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے۔
(۱۲) ہدایت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
(۱۳) مشرکوں کے لئے استغفار کی ممانعت۔
(۱۴) اکابر و اسلاف کی تعظیم میں غلو کرنا نقصان دہ ہے۔
(۱۵) نجات کا دار و مدار زندگی کے آخری اعمال پر ہے کیونکہ اگر ابو طالب بوقت وفات کلمہ کا اقرار کر لیتے تو ضرور فائدہ ہوتا۔
(۱۶) جب محمد رسول اللہ ﷺ جیسی جلیل القدر اور عظیم الشان ہستی سے ہدایت اور توفیق کی نفی ہوگئی تو پھر تمام اہم معاملات، ہدایت، مغفرت، برائیوں سے دوری اور بھلائیوں کے حصول کے لیے بھی اللہ عز وجل کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ دلی تعلق رکھنا باطل ہے۔

حدیث نمبر:۳۰

قال الإمام مسلم فی کتاب البر والصلة والآداب من صحیحه:

حدثنا قتیبة بن سعید عن مالك بن أنس (ح) وحدثنا قتیبة ومحمد بن رمح عن اللیث بن سعد (ح) وحدثنا أبو بكر بن أبی شیبة حدثنا عبدة ویزید بن هارون كلهم عن یحیی بن سعید (ح) وحدثنا محمد بن المثنی (واللفظ له) حدثنا عبد الوهاب 'یعنی الثقفی' سمعت یحیی بن سعید أخبرنی أبو بكر وهو ابن محمد بن عمرو بن حزم، أن عمرة حدثته أنها سمعت عائشة تقول: سمعت رسول اللّٰه یقول: ((ما زالَ جِبْرِیْلُ یُوْصِیْنِیْ بِالجَارِ حَتّٰی ظَنَنْتُ أَنَّه لَیُوَرِّثَنَّهُ))(رقم الحدیث:٢٦٢٤)

تخریج:

امام مسلم علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو دو طریق سے نقل فرمایا ہے، ایک طریق اوپر گزرا، دوسرا طریق حسب ذیل ہے:

حدثنی عمرو الناقد حدثنا عبد العزیز بن أبی حازم حدثنی هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة عن النبی بمثله.

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو اپنی صحیح (كتاب الأدب) (باب الوصلة بالجار) میں نقل فرمایا ہے (رقم الحديث: ٦٠١٥)

أبوداود نے اس کو (كتاب الأدب) (باب فی حق الجوار) میں نقل فرمایا ہے (رقم الحديث: ٥١٥١)

ترمذی نے (كتاب البر والصلة) (باب ما جاء فی حق الجوار) میں نقل فرمایا ہے، (رقم الحديث: ١٩٤٢)

ابن ماجہ نے (كتاب الأدب) (باب حق الجوار) میں نقل فرمایا ہے (رقم الحديث: ٣٦٧٣)

نیز یہ حدیث بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی مروی ہے، جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

(مَازَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِي بِالجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّه سَيُوَرِّثُهُ).

نیز یہ حدیث سنن أبوداود و ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے بھی مروی ہے۔

مزید ترمذی نے فرمایا:

وفی الباب عن عائشة، وابن عباس، وأبی هريرة، وأنس، والمقداد بن الأسود، وعقبة بن عامر، وأبی شريح، وأبی أمامة. قال أبو عيسى: هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه، وقد روى هذا الحديث عن مجاهد عن عائشة وأبی هريرة عن النبی أيضاً.

صحابی کے متعلق:

نام: عائشة

کنیت: أم عبدالله

القابات: حبيبة الرسول، صديقه، حميراء

والد کی طرف سے سلسلہ نسب اس طرح ہے:عائشة بنت أبی بکر بن أبی قحافه عثمان بن عامر بن عمر بن کعب بن سعد بن تیم بن مره بن کعب بن لوی بن غالب بن فهر بن مالك . جبکہ والدہ محترمہ کی طرف سے سلسلہ نسب کچھ یوں ہے: عائشة بنت أم رومان زینب بنت عامر بن عویمر بن عبد شمس بن عتاب بن اذینه بن سبیع بن وهمان بن حارث بن غنم بن مالك بن کنانه.

آپ کی کنیت اُم عبداللہ ہے،اگر چہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، ایک مرتبہ آپ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خواتین نے تو اپنی اولاد کے نام پر اپنی اپنی کنیت رکھ لیں، میں اپنی کنیت کس کے نام پر رکھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھانجے عبداللہ کے نام پر رکھ لو،اس وجہ سے آپ نے اپنی کنیت ''اُمّ عبداللہ'' رکھ لی۔حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ یہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بیٹے ہیں، سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی شادی مشہور صحابی رسول سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی،عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نمایاں کارنامے حدیث وتاریخ کی کتب میں بکثرت موجود ہیں۔

ولادت

حضرت عائشہؓ کی تاریخ ولادت کے متعلق تاریخ وسیرت کی تمام کتابیں خاموش ہیں،ان کی ولادت کی صحیح تاریخ نبوت کے پانچویں سال کا آخری حصہ ہے۔

نکاح

ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ ہجرت سے ۳ ربرس قبل حضور اکرم ﷺ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں اور ۹ ربرس کی عمر میں رخصتی ہوئی،ان کا مہر بہت زیادہ نہ تھا صرف ۵۰۰ درہم تھا۔

وفات

سن ۵۸ ہجری کے ماہ رمضان میں حضرت عائشہؓ بیمار ہوئیں اور انہوں نے

وصیت کی کہ انہیں امہات المومنینؓ اور رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کے پہلو میں جنت البقیع میں دفن کیا جائے۔

ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ منگل کی رات ام المومنین عائشہؓ نے وفات پائی، آپؓ ۱۸ سال کی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں اور وفات کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس تھی، حضرت ابوہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت عائشہؓ اور احادیث نبوی

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ علمی صداقت اور احادیث روایت کرنے کے حوالے سے دیانت وامانت میں امتیاز حاصل تھا، ان کا حافظہ بہت قوی تھا جس کی وجہ سے وہ حدیث نبوی کے حوالے سے صحابہ کرام کے لیے بڑا اہم مرجع بن چکی تھیں۔

حضرت عائشہ حدیث حفظ کرنے اور فتویٰ دینے کے اعتبار سے صحابہ کرام سے بڑھ کر تھیں، حضرت عائشہ نے (۲ ہزار ۲ سو) احادیث روایت کرنے کی سعادت حاصل کی۔

دور نبویؐ کی کوئی خاتون ایسی نہیں جس نے ام المومنین عائشہؓ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے احادیث روایت کرنے کی سعادت حاصل کی ہو، صدیقہؓ سے ۱۷۴ احادیث ایسی مروی ہیں جو بخاری ومسلم میں ہیں۔

سندی نکات:

(۱) حدیث کے تمام راوی صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں، سوائے شیخ مسلم (ابوبکر بن ابی شیبہ) کے جن کی حدیث کو ترمذی نے روایت نہیں کیا ہے، اور دوسرے شیخ (محمد بن رمح) کے جن سے صرف مسلم اور ابن ماجہ نے روایت لی ہے۔

(۲) یحییٰ بن سعید اور ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم تابعین کے طبقے سے ہیں، نیز دونوں مدنی انصاری، نجاری ہیں، دونوں مدینہ کے قاضی رہے ہیں۔

(۳) محمد بن المثنی، صحاح ستہ کے مصنفین کے شیخ ہیں، ان میں سے ہر ایک نے براہ راست ان سے روایت کی ہے، اور ان کا لقب زمن ہے بکسر المیم۔

(۴) محمد بن المثنیٰ اپنے نام سے مشہور ہیں، ان کی کنیت ابوموسیٰ ہے، اور وہ اپنی کنیت سے بھی مشہور تھے۔

(۵) محمد بن بشار بھی صحاح ستہ کے مصنفین کے شیخ ہیں، ان میں سے ہر ایک نے براہ راست ان سے روایت کی ہے، اور ان کا لقب بندار ہے۔

تشریح:

ایک انصاری صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے یہاں سے نکلا، میرا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنا تھا، میں نے دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں اور کوئی شخص آپ سے متوجہ ہے، میں نے سوچا کہ آپ دونوں کوئی ضروری گفتگو کر رہے ہیں لہٰذا میں اپنی جگہ بیٹھ گیا، اللہ کی قسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک کھڑے رہ گئے کہ اس طویل قیام کی وجہ سے مجھے آپ پر رحم آنے لگا، پھر جب واپس ہوئے تو میں آپ کی طرف بڑھا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس شخص نے آپ کو اتنی دیر تک کھڑا رکھا کہ مجھے آپ پر رحم آنے لگا، آپ نے فرمایا: تمہیں معلوم یہ کون تھا؟ میں نے کہا: نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے جو مجھے برابر پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کر رہے تھے حتی کہ میں نے سمجھا کہ اسے وارث قرار دیں گے، ہاں! اگر تم ان سے سلام کرتے تو وہ تمہارے سلام کا جواب دیے ہوتے۔ (مسند احمد)

ہمسایہ یا پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں، یہ رہنا اور بسنا خواہ وقتی ہو یا دائمی، سکونت کا ہو یا عمل کا، دونوں مسلمان ہوں یا مسلم اور کافر، دوست دوست ہوں یا دوست و دشمن، رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار، غرض یہ کہ ہر ایک پر پڑوسی و ہمسایہ کا اطلاق ہوتا ہے، شریعت نے انکے کچھ حقوق و واجبات رکھے ہیں، جن کا ذکر نہایت ضروری ہے جیسا کہ اوپر مذکورہ دونوں حدیثوں سے واضح ہے، بالاختصار پڑوسی کے اہم حقوق درج ذیل ہیں:

(۱) **حسن سلوک:** اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾

ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) اور مسافروں کے ساتھ احسان کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم، بروایت ابو ہریرہ)

(۲) **امن و امان دینا:** ارشاد نبوی ہے: اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، عرض کیا گیا کون؟ آپ نے فرمایا: وہ شخص جسکی شرارتوں سے اسکا پڑوسی محفوظ نہ رہے۔ [بخاری و مسلم، بروایت ابو ہریرہ]

ایک اور جگہ ارشاد ہے: کسی آدمی کا دس عورتوں سے زنا کرنا اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنے سے آسان ہے، کسی آدمی کا دس گھروں سے چوری کرنا اپنے پڑوسی کے گھر سے چوری کرنے کے مقابلہ میں ہلکا ہے۔۔۔ (مسند احمد، بروایت المقداد)

(۳) **محبت اور خیر خواہی کا جذبہ:** ارشاد نبوی ہے: اس ذات کی قسم جسکے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بھی بندہ حقیقی مومن بن نہیں سکتا جب تک کہ اپنے پڑوسی کیلئے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (صحیح مسلم، بروایت انس)

(۴) **خبر گیری کرنا:** ارشاد نبوی ہے: جو شخص آسودہ ہو کر رات گزارے جبکہ اسکا پڑوسی بھوکا ہے اور اسے اسکا علم بھی ہے تو اسکا مجھ پر ایمان نہیں ہے۔ [الطبرانی، بروایت انس]

اسی حکم میں ہدیہ و تحفہ پیش کرنا بھی داخل ہے، ارشاد نبوی ہے: اے مسلمان عورتو! ہرگز کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کیلئے (معمولی ہدیہ کو بھی) حقیر نہ سمجھے، خواہ بکری کے کھر ہی کا کیوں نہ ہو۔ [صحیح البخاری، بروایت ابو ہریرہ]

(۵) **تکلیف پر صبر:** ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوکر اپنے پڑوسی کی شکایت کرنے لگا تو آپ نے فرمایا: صبر سے کام لو [ابوداود، الترمذی، بروایت ابوہریرہ]

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے محبوب لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: وہ شخص جسکا پڑوسی برا ہو، اسے تنگ کر رہا ہو اور وہ اسکی تکلیف پر صبر سے کام لے رہا ہو۔ (مسند احمد)

حدیث نمبر:۴

قال الإمام مسلم رحمه الله في آخر (كتاب القدر) من صحيحه:

حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة وابن نمير قالا حدثنا عبد الله بن إدريس عن ربيعة بن عثمان عن محمد بن يحيى بن حبان عن الأعرج عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إلى الله مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وفي كُلٍّ خَيْرٌ. احْرِصْ على ما يَنْفَعُكَ، واسْتَعِنْ باللهِ وَلا تَعْجِزْ، وإنْ أَصابَكَ شَيءٌ، فلا تَقُلْ: لو أَنِّي فَعَلْتُ كانَ كَذا وَكَذا، وَلَكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللهُ وَما شاءَ فَعَلَ؛ فإنَّ (لو) تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطانِ. (٢٦٦٤)

ترجمہ:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طاقتور مسلمان اللہ کے نزدیک بہتر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے ناتواں مسلمان سے اور ہر ایک طرح کا مسلمان بہتر ہے، حرص کر ان کاموں کی جو تجھ کو مفید ہیں (یعنی آخرت میں کام دیں گے) اور مدد مانگ اللہ سے اور ہمت مت ہار اور تجھ پر کوئی مصیبت آئے تو یوں مت کہہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ مصیبت کیوں آتی لیکن یوں کہہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی تھا جو اس نے چاہا کیا۔ اگر مگر کرنا شیطان کے لیے راہ کھولنا ہے۔'' (یعنی جو اس اعتقاد سے کہے کہ اسباب کی تاثیر مستقل ہے اور اگر یہ سبب نہ ہوتا تو مصیبت نہ آتی تو وہ اسلام سے نکل گیا اس لیے کہ کوئی کام اللہ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوتا اور جو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر اعتقاد رکھتا ہے اور

جانتا ہے کہ اسباب کی تاثیر بھی اس کے حکم سے ہے اس کو اگر مگر کہنا جائز نہیں اور اس کی مثال یہ ہے کہ مومن کہتا ہے بارش اچھی ہوئی اب کے غلہ بہت ہوگا اور کافر بھی کہتا ہے، مومن کا کہنا اور اعتقاد سے ہے اور کافر کا کہنا اور اعتقاد سے، اور جو اعتقاد کافر کا ہے اس اعتقاد سے یہ کلمہ کہنا درست نہیں، اور مومن کے اعتقاد سے درست ہے۔)

تخریج:

مذکورہ حدیث مندرجہ ذیل مصادر میں موجود ہے:

۱ - مسلم: كتاب القدر باب فی الأمر بالقوة وترك العجز(رقم الحديث: ٤٨١٦)

۲ - ابن ماجه فی سننه باب فی القدر (رقم الحديث ٧٩)

۳ - نسائی كبرى مَا يَقُولُ إِذَا غَلَبَهُ أَمْرٌ (رقم الحديث ٩١٣٧)

٤ - صحيح ابن حبان بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ الْكَلَامِ وَمَا لَا يُكْرَهُ(رقم الحديث ٩٨١٤)

٥ - مسند الحميدی بَابٌ جَامِعٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رقم الحديث ١٠٦٤)

صحابی کے متعلق:

نام: عبدالرحمٰن بن صخر۔

کنیت: ابو ہریرہ۔

سن ولادت: ۱۹ق، ھ

سن وفات: ۵۹ھ

ماں کا نام: میمونہ بنت صبیح الدوسیۃ

بیٹے : بلال، عبدالرحمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مختصر سوانح حیات:

حضرت ابو ہریرہؓ کی پرورش اپنے خاندانی قبیلہ "دوس" میں ہوئی، اور طفیل بن عمرو

الدوسی رضی اللہ عنہ کی وساطت سے اسلام قبول کیا، ہجرت سے چھ/۶ سال بعد تک یہ اپنی قوم دوس میں ہی رہے، اس کے بعد سن سات/۷ ہجری کے شروع میں، غزوۂ خیبر کے موقع پر، اٹھائیس/۲۸ سال کی عمر میں یہ اپنی قوم کے ایک وفد کے ہمراہ مدینہ منورہ آکر رسول ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اسی دوسی نوجوان نے اپنے آپ کو رسول ﷺ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، مسجد نبوی میں، اہل الصفۃ کے زمرہ میں مسکین کی زندگی بتانے لگے، اور نبی اکرم ﷺ سے تعلیم حاصل کرتے رہے، اس طرح آپ تمام اصحابِ رسول ﷺ میں حدیثِ رسول ﷺ کے سب سے زیادہ جان کار، حافظ اور روایت کرنے والے بن گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے کثیر الروایہ ہونے کے اسباب ووجوہ:

۱- ابو ہریرہؓ ہمیشہ رسول اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر رہتے تھے، اور شاذ و نادر ہی غیر حاضر ہوتے تھے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت سے واضح ہے۔

۲- ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تحصیل علم کے بڑے دلدادہ تھے، اور حضور ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی تھی کہ انھیں نسیان کی بیماری لاحق نہ ہو۔

۳- کثرت روایت کی تیسری وجہ یہ کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا تھا، اس لئے ان کا علم کامل اور وسعت پذیر ہو گیا۔

۴- ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے بعد طویل عمر پائی، آپ نبی کریم ﷺ کے بعد سینتالیس/۴۷ سال بقید حیات رہے، حدیث نبوی کی نشر واشاعت کرتے رہے آپ مناصب ومشاغل اور فتنوں سے دور رہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث کی تعداد:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پانچ ہزار تین سو چوہتر/۵۳۷۴ احادیث ہیں ان میں بخاری و مسلم میں تین سو پچیس/۳۲۵ روایات ہیں، اس میں سے صحیح بخاری میں ترانوے/۹۳ اور مسلم میں ایک سو چوراسی/۱۸۴ احدیثیں ہیں۔

سندی نکات:

(۱) سندی سلسلہ کے راویوں میں تین راوی کوفی ہیں: ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن نمر، اور عبداللہ بن ادریس، اوران میں سے چار مدنی ہیں۔

(۲) راویوں میں سے دوراوی کنیت سے مشہور ہیں: ابو ہریرہ جن کا نام عبدالرحمن بن صخر ہے علی الراجح اورابوبکر بن ابی شیبہ جن کا نام عبداللہ بن محمد ہے۔

(۳) راویوں کے سلسلے میں ایک شخص ہے جو اپنے لقب سے مشہور ہے: الاعرج، جن کا نام عبدالرحمن بن ہرمز ہے۔

تشریح:

اللہ کے رسول ﷺ کی یہ وصیت ان عظیم وصیتوں میں سے ہے جن کی ہر ایک کو دینی اور دنیوی امور میں ضرورت پیش آتی ہے، لہٰذا وہ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، طاقتور مومن کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان و یقین، اللہ کی اطاعت اوراس کے دین کی مدد کرنے، حق کو ثابت اور باطل کا رد کرنے میں طاقتور ہو، اسی طرح علم و جسم، مشکلات کا سامنا کرنے اور دشواریوں کو برداشت کرنے، مصائب و آلام پر صبر کرنے، اچھی اور بری تقدیر پر راضی ہونے اوران کے علاوہ ان سبھی اوصاف میں طاقتور ہو جن میں مسلمان ایک دوسرے سے متفاوت ہوتے ہیں جیسے عزم واستقلال، شجاعت و بہادری، صدق و اخلاص اور دیگر ایمان کے شعبے۔

نبی ﷺ نے اپنی امت کو ایک جامع و مانع نصیحت فرمائی اور انہیں ایسی اشیاء کے حصول کے لیے محنت کرنے اور ایسے کام کرنے کا حکم دیا، جو ان کے لیے نفع بخش ہوں، چاہے ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے، اگر کبھی دینی و دنیاوی منفعت کا باہم تعارض ہو جائے، تو اس صورت میں دینی منفعت مقدم ہوتی ہے؛ کیوں کہ جب دین درست ہوتا ہے تو دنیا بھی درست ہو جاتی ہے، جب کہ اگر دنیا کی درستگی دین کے بگاڑ کے ساتھ ہو تو دنیا

بھی بگڑ جاتی ہے، آپ ﷺ نے نصیحت کی کہ لوگ اللہ سے مدد مانگیں، اگر چہ وہ بہت ہی معمولی چیز کے لیے ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ وہ سستی اور عاجزی کی طرف مائل نہ ہوں، پھر چاہت رکھنے، محنت کرنے، اللہ سے مدد مانگنے اور کام کو جاری رکھنے کے بعد بھی اگر نتائج من پسند نہ نکلیں، تو آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی کہ پھر یوں نہ کہیں کہ: اگر ہم ایسا کر لیتے تو ایسا ہو جاتا، کیوں کہ یہ چیز ان کے ارادے کے دائرے سے بالاتر ہے، بندے کو جس شے کے کرنے کا حکم ہے وہ اسے کرتا ہے، جب کہ بات اللہ ہی کی غالب رہتی ہے، ایسے میں افسوس اور اگر مگر کے الفاظ وسوسوں، دکھوں، ندامتوں اور غموں کا سبب ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بجائے بندے کو وہ کہنا چاہئے جو وارد ہوا ہے اور جس کا معنی یہ ہے کہ: یہ اللہ کا ارادہ اور اس کا فیصلہ ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

حدیث نمبر: ۵

قال الإمام مسلم رحمه الله في كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها من صحيحه:

حدثنا عبد الله بن مسلمة بن قعنب حدثنا حماد بن سلمة عن ثابت وحميد عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله : ((حُفَّت الجَنَّةُ بِالمَكَارِهِ وحُفَّت النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ))(رقم الحديث :۲۸۲۲) وحدثني زهير بن حرب حدثنا شبابة حدثني ورقاء عن أبي الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة عن النبي بمثله.

حدیث کا ترجمہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جہنم کو خواہشات سے گھیر دیا گیا ہے اور جنت کو ناگوار چیزوں سے گھیرا گیا ہے''۔

تخریج:

یہ حدیث مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے جب کہ بخاری نے کتاب

الرقاق (باب حجبت النار بالشهوات) میں اس کو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ (رقم الحدیث :٦٤٨٧)

نیز یہ مندرجہ ذیل مصادر میں بھی موجود ہے:

سنن الترمذی کتاب صفة الجنة، (باب ما جاء حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات) (رقم الحديث:٢٥٥٩)

سنن الترمذی عن أبی هريرة (رقم الحديث ٢٥٦٠)

سنن الدارمی كتاب الرقاق، باب حفت الجنة بالمكاره

مسند احمد

صحابی کے متعلق:

نام ونسب: انس بن مالك بن النضر بن ضمضم بن زيد المحدث المفتی ابو حمزه الأنصاری،الخزاعی، المدنی، خادم رسول الله صلى الله عليه وسلم(أسد الغابة ج ١ ص ١٧٧،الاستيعاب ص ٩٠،سير أعلام النبلاء ج٤ ص ٢٠٢)

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت میں دس سال کا تھا، سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو اس وقت میری عمر ۸ برس تھی تو میری ماں (ام سلیم رضی اللہ عنہا) مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! انصار کے مردوں اور عورتوں نے آپ کو تحائف پیش کیے اور میرے پاس اس بچے کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی جو میں آپ کو بطور تحفہ کے پیش کرتی میرے اس بچے کو قبول فرمالیں یہ آپ کی خدمت کیا کریگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خدمت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عشر سنین فما سبنی سبّة قط ولا ضربنی ضربة قط ولا عبس فی وجهی. (سیر أعلام النبلاء ج٤ ص٢٠٤، تهذیب الکمال للمزی ج١ ص٥٧٩)

یعنی ۱۰ برس میں نے آپ ﷺ کی خدمت کی، اس پورے عرصے میں کبھی بھی مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا نہ گالی دی اور نہ اپنے چہرے میں شکن لائے (تیوری چڑھائی)۔

سن وفات:

خادم رسول ﷺ سیدنا انس رضی اللہ عنہ وہ چراغ علم ہیں جن سے دنیا والے ۹۳ برس اپنے علم کی شمع جلاتے اور تاریکیوں کو روشنی سے بدلتے رہے، ان کی وفات کے تعلق سے تین قول ہیں۔ (۱) ۹۱ھ (۲) ۹۲ھ (۳) ۹۳ھ آخری قول مشہور ہے اور یہی جمہور کا قول ہے اس حساب سے آپ کی کل عمر ۱۰۳ برس بنتی ہے۔

آپ کی وفات پر امام مورق رحمہ اللہ نے فرمایا:

ذهب اليوم نصف العلم کہ آج آدھا علم رخصت ہوگیا۔ (تهذیب الکمال للمزی ج١ ص٥٨٢، البدایه والنهایه ج٥ ص١١٢)

نماز جنازہ:

آپ رضی اللہ عنہ کی نماز حضرت قطن بن مدرک الکلابی رحمہ اللہ نے پڑھائی، وصلی علیه قطن بن مدرك الكلابی (أسد الغابة ج١ ص١٢٩، الاستیعاب ص٩١)۔

سندی نکات:

(۱) پہلی سند کے راوی سب بصری ہیں اس لئے یہ بصری راویوں سے مسلسلاً مروی ہے۔

(۲) حماد بن سلمہ اپنے چچا حمید الطّویل سے روایت کرتے ہیں، اور دونوں حضرات کا انتقال نماز پڑھتے ہوئے اچانک ہوا۔

(۳) حماد بن سلمہ نے ثابت اور حمید کی سند سے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور وہ ان کی حدیث کو لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں جیسا کہ ذہبی نے 'المیزان' میں ذکر کیا ہے۔

تشریح:

جنت تک لے جانے والا رستہ ایسی اشیا سے پُر ہے، جنھیں انسان ناپسند کرتا ہے؛ کیوں کہ نفس آرام وسکون کو چاہتا ہے۔ یہی حال جہنم کا ہے، انسان اس میں اس وقت داخل نہیں ہوتا، جب تک اس کے اور اپنے مابین موجود پردے کو، حرام کردہ اشیاء کے ارتکاب اور طاعات سے دور ہو کر چاک نہ کردے۔ جو شخص پردہ چاک کر دیتا ہے، وہ اس شے تک پہنچ جاتا ہے، جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ جنت کے گرد پڑا ہوا پردہ ناگوار کاموں کو کرنے سے چاک ہوتا ہے اور جہنم کے گرد پڑا ہوا پردہ پرلذت چیزوں کے ارتکاب سے پھٹتا ہے، عبادتوں میں دل جمعی کے ساتھ مصروف ہونا اور ان پر ہمیشگی برتنا اور اس سلسلے میں پیش آنے والی مشقتوں کو برداشت کرنا، غصے کو دبانا، عفو وبردباری سے کام لینا، برے انداز سے پیش آنے والے کے ساتھ اچھائی اور احسان کا معاملہ کرنا اور شہوتوں سے گریز کرنا وغیرہ، یہ سب ان ناگوار باتوں میں داخل ہے (جن کے کرنے سے انسان جنت تک پہنچتا ہے)، نفس نماز پر مواظبت کو ناپسند کرتا ہے؛ کیوں کہ اس میں محنت صرف ہوتی ہے اور نفس کے پسندیدہ دنیوی امور سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے، اسی طرح نفس جہاد اور صدقہ کرنے کو ناپسند کرتا ہے؛ کیوں کہ اس کی فطرت میں حب مال ہے، اسی طرح دیگر طاعات میں بھی اسے ناگواری ہوتی ہے، جب انسان اوامر کو بجالاتے ہوئے اور نواہی سے گریز کرتے ہوئے اپنی شہوت کا قلع قمع کردے اور ہوائے نفس کی مخالفت کرے، تو اس وجہ سے وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جہنم سے دور ہٹ جاتا ہے، لذتیں، جن سے جہنم ڈھکی ہوئی ہے، ان سے مراد وہ لذات ہیں، جو حرام ہیں، مثلاً شراب نوشی، زنا، اجنبی عورت

کو دیکھنا، غیبت اور گانے بجانے کے آلات کو استعمال کرنا وغیرہ، وہ لذتیں جو جائز ہیں، وہ ان میں شامل نہیں، تاہم کثرت کے ساتھ ان میں مشغول ہونا مکروہ ہے، اس اندیشے کی وجہ سے کہ کہیں یہ کسی حرام شے تک نہ لے جائیں، دل کو سخت نہ کر دیں، طاعتوں سے بے گانہ نہ کر دیں یا پھر دنیا حاصل کرنے میں مگن نہ کر دیں۔

حدیث سے مندرجہ ذیل امور اخذ کئے جا سکتے ہیں:

(۱) طاعت کی تاکید اور ترغیب خواہ نفس کو اس سے نفرت ہو۔

(۲) خواہشات کی مذمت، خواہ نفس ان کی طرف مائل ہو۔

(۳) مصیبت کے وقت صبر کا انجام اچھا ہوتا ہے۔

(۴) شہوت رانی کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔

(۵) نیکی کے کام میں مجاہدہ ہے، اور اسی کے بقدر اللہ کی طرف سے بندے کو جزا ملتی ہے۔

(۶) جنت کا راستہ پریشانیوں سے پر ہے۔

(۷) جہنم کا راستہ خواہشات و مرغوبات سے پر ہے۔

حدیث نمبر:۶

قال الإمام مسلم رحمه الله في أول كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ من صحيحه:

حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ حَاتِمِ بْنِ مَيْمُونٍ، حَدَّثَنَا ابْنُ مَهْدِيٍّ، عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ صَالِحٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ الْأَنْصَارِيِّ، قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، عَنِ الْبِرِّ وَالإِثْمِ فَقَالَ: ((الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، والإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ))

(رقم الحديث:۲۵۵۳)

ترجمہ:

سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ

سے پوچھا: بھلائی اور برائی کے متعلق، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بھلائی حسن خلق کو کہتے ہیں (یعنی خوش مزاجی سے ملنا، لوگوں کی دلداری اور دل جوئی کرنا، حتی المقدور دنیاوی امور میں کسی کو ناراض نہ کرنا) اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں چبھے اور تجھ کو برا لگے کہ لوگ اس سے مطلع ہوں۔''

تخریج:

(۱) مسلم، كتاب البر والصلة، باب تفسير البر والإثم .

(۲) البخاری فی الأدب المفرد (۲۹۵:۸۳)، باب حسن الخلق

(۳) الدارمی كتاب الرقاق بَابٌ فِي الْبِرِّ وَالْإِثْمِ(۳۰۲)

(٤) الترمذی فی الزهد باب ما جاء فی البر والإثم (۲۳۹۰)

(٥) الطحاوی فی "شرح المشكل" (۲۱۳۸)

(٦) ابن حبان (۳۹۷)۔

(۷) الطبرانی فی "مسند الشاميين" (۹۸۰) و (۲۰۲۳)

صحابی کے متعلق:

نواس بن سمعان اصحاب صفہ سے ہیں۔

نواس بن سمعان بن خالد بن عمرو بن عبداللہ ابوبکر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ عامری کلابی شامی شمار ہوتے ہیں قبیلہ بنی کلب سے ہیں، بعض نے فرمایا کہ آپ انصاری ہیں، آخر میں شام میں قیام فرمایا۔

سندی نکات:

(۱) یہ حدیث شیخین میں سے صرف امام مسلمؒ نے روایت کی ہے۔

(۲) عبدالرحمٰن بن مہدی کی روایت صحاح ستہ میں ہے۔

(۳) معاویہ بن صالح عبدالرحمٰن اور ان کے والد جبیر بن نفیر کی روایت بخاری میں نہیں ہیں، یعنی مسلم ان سے اخذ کرنے میں منفرد ہیں۔

تشریح:

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے (البِـــر) یعنی: نیکی کا تعارف پیش فرمایا ہے، (البِر) ایک ایسا کلمہ ہے جس کا اطلاق ہر خصلتِ خیر پر ہوتا ہے، جس کی رُو سے پورے دین کو (البـــر) کہا جاسکتا ہے، عربی لغت میں اس قدر وسعت اور جامعیت ہے کہ بعض کلمات پورے دین کی تعبیر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جیسے کلمہ (التـقـوی) ہے، اس قدر جامع ہے کہ دین کے ہر ہر شعبہ نیز تمام خصائلِ خیر کا احاطہ کیے ہوئے ہے، (البـــر) کی ضد (الإثم) ہے، جو گناہ کے معنی میں مستعمل ہے، قرآن حکیم میں بھی (البر) کے مقابلے میں ضد کے طور پہ (الإثم) یعنی: گناہ کا لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ:۳)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حسنِ خلق کو (البِر) یعنی: نیکی قرار دیا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ حسن خلق (البِر) کی انواع میں سے ایک نوع ہے، یہ معنی نہیں ہے کہ (البِر) یعنی نیکی صرف حسن خلق میں محصور ہے۔ حسن خلق کو (البِـــر) کی انواع میں سے سب سے بڑی نوع قرار دیا جاسکتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے دن اللہ کے میزان میں سب سے بھاری نیکی اخلاقِ حسنہ ذکر فرمائی ہے۔

(البِر) کے بیان میں صرف حسن الخلق کا ذکر کرنا ایسے ہی ہے جیسے آپ ﷺ نے (الـحـج عـرفة) فرمایا ہے، یعنی: حج، عرفہ کا نام ہے، اب اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حج صرف وقوفِ عرفہ ہی کا نام ہے، بلکہ حج کے دیگر بہت سے ارکان اور واجبات موجود ہیں، البتہ وقوفِ عرفہ حج کا رکنِ اعظم کہلاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے وقوفِ عرفہ کو حج قرار دیا، لہٰذا حدیثِ زیرِ بحث کی رُو سے حسنِ خلق نہایت مہتم بالشان نیکی شمار ہوگی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ حدیثِ مذکور میں آپ ﷺ نے صرف حسن خلق کو (البر) قرار دیا ہے۔

واضح ہو کہ حسنِ خلق کی دو قسمیں ہیں:

(۱) حسنِ خلق مع اللہ تعالیٰ، یعنی: اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ۔

(۲) حسنِ خلق مع عباداللہ، یعنی: اللہ کے بندوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاو۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھے اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تمام احکامِ شریعہ کو مکمل رضا اور تسلیم کے ساتھ قبول کرے، کسی شرعی حکم کے تعلق سے نفس میں کوئی تنگی یا خلجان نہ ہو، بلکہ انشراحِ صدر کے ساتھ قبول کا جذبہ ہو، مثلاً: اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز کا حکم ملے تو کسی تنگی کے بغیر انتہائی خوشدلی اور شوق وذوق سے اسے ادا کرے، اسی طرح زکاۃ اور روزے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ خلق کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے احکامِ قدریہ کے تعلق سے بھی قبول وتسلیم کا مادہ ہو؛ کیونکہ تقدیر کے فیصلے تکلیف دے بھی ہوسکتے ہیں، تکلیف کا تعلق اہل وعیال، مال ودولت اور جان وغیرہ سے بھی ہوسکتا ہے، جن پر برضاء ورغبت صبر کا دامن تھامے رہنا، کسی قسم کا شکوہ نہ کرنا اور ان فیصلوں کے تعلق سے شرعی ہدایات سے جڑے رہنا، حسنِ خلق کی بہترین صورت قرار پائے گی۔

لوگوں کے ساتھ حسنِ خلق سے مراد یہ ہے کہ ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملا جائے، اپنی زبان یا ہاتھوں کی تکلیف سے انہیں بچایا جائے، ان کی جانب سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کیا جائے اور ضرورت پڑنے پر اپنے مال تک کی سخاوت جیسے قابلِ تعریف اقدام کو اپنا لیا جائے۔

اسی معنی میں رسول اللہ ﷺ کی دوسری حدیث بھی وارد ہے:

(وخالقِ الناسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ)

یعنی: لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرو۔

قرآن حکیم نے رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کا مختلف اسالیب سے ذکر فرمایا ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم: ٤)

ترجمہ: اور بیشک آپ بہت بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہیں۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔

اس سے واضح ہوا کہ حسنِ خلق ایک ایسا عمدہ وصف ہے جسے انسان کے محاسن اور مکارمِ خیر میں شمار کیا جاتا ہے۔

(البر) کے مقابلے میں (الاثم) ہے، جو گناہ کے معنی میں مستعمل ہے، آپ ﷺ نے (الاثم) کی تعریف میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ جو چیز آپ کے دل میں کھٹکے اور جس چیز کے ارتکاب کے تعلق سے آپ اپنے نفس میں قلق محسوس کریں اور اس کے لوگوں پر ظاہر ہونے کو برا جانیں، وہ (الاثم) یعنی گناہ ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں نفس سے مراد نفسِ مومن ہے، ایک فاسق اور فاجر بلکہ سرکش قسم کے انسان کا نفس مراد نہیں ہے، وہ ہرگز گناہ کو پہچاننے کا معیار نہیں بن سکتا۔

مومن کا نفس انتہائی پاکیزہ اور صاف ستھرا ہوتا ہے جو نیکیوں پر مطمئن ہوتا ہے اور گناہوں پر وحشت محسوس کرتا ہے، اور اس بات کو برا خیال کرتا ہے کہ یہ معاملہ لوگوں پر ظاہر نہ ہو جائے۔

یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں اس طرح وارد ہے:

"دَعْ مَا يُرِيبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيبُكَ"

(مسند احمد:۱۲۵۷۸، سنن نسائی:۵۷۱۱، جامع ترمذی:۲۵۱۸)

یعنی: جو چیز تمہیں شبہ میں ڈال دے اسے چھوڑ دو، اور ایسا عمل اختیار کرلو جو شک وشبہ سے پاک ہو۔

اس حدیث میں بندۂ مومن کے تعارف کے تعلق سے ایک ضابطہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے گناہوں کے لوگوں پر ظاہر ہونے کو برا محسوس کرے گا، جبکہ ایک فاجر انسان اپنے گناہوں کے ظاہر ہونے کو کبھی برا محسوس نہیں کریگا، بلکہ بعض لوگ تو اپنے

گناہوں کو بڑے فخر کے انداز میں بیان کرتے پھرتے ہیں، اس قماش کے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دوسری حدیث میں مجاہرین قرار دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن أبی هُرَيْرَةَ، يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "كُلُّ أُمَّتِي مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ، وَإِنَّ مِنَ الْمُجَاهَرَةِ أَنْ يَعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلًا، ثُمَّ يُصْبِحَ وَقَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَيَقُولَ: يَا فُلَانُ، عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا، وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ، وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ"

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: بے شک میری پوری امت معافی کی مستحق ہے، سوائے ان لوگوں کے جو گناہوں کو برسرِ عام ظاہر کرتے ہیں، ظاہر کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان رات کو کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، اللہ رب العزت اس پر پردہ ڈال دیتا ہے، اور وہ لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ رات میں نے گناہ کا فلاں کام کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے رات بھر اس کے گناہ پر پردہ ڈالے رکھا اور وہ خود صبح ہوتے ہی اس پردے کو پھاڑ ڈالتا ہے اور اپنے گناہ کو ظاہر کر دیتا ہے۔

یہ بندہ انتہائی خطرناک روش پر قائم ہے، اس قسم کے لوگ آہستہ آہستہ گناہ کو نیکی سمجھ بیٹھتے ہیں، اور انتہائی بے پرواہی کے ساتھ اس کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، (والعیاذ باللہ) علاوہ ازیں خود ہی اپنے گناہوں کو لوگوں پر کھولنا، شریعت کے ساتھ مذاق کی ایک بدترین شکل ہے، مثلاً: ایک شرابی شخص کا ڈینگیں مارتے ہوئے کہنا کہ رات میں نے اتنے جام شراب کے پی لئے ہیں، یہ جملہ تو شریعتِ مطہرہ کے ساتھ مذاق ہے، اس قسم کا مذاق بندے کو کفر کی وادی میں ڈھکیل دیتا ہے۔ (واللہ المستعان)

شراب نوشی یا زنا کاری ایسے گناہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، ایسی بے حیائی اور بدکرداری کا مظاہرہ کرنے والا ویسے ہی ملعون قرار دیا گیا ہے، اگر یہ شخص اللہ تعالیٰ کی حرمت کو پامال کر کے مذاقاً و سخریۃً اپنے گناہوں کو اچھالتا ہے، تو اس کا دین و ایمان

کہاں رہا؟ یقیناً یہ شخص توبہ نہ کرنے کی صورت میں واجب القتل ہے۔

اللہ رب العزت نے نفسِ مومن کو ایک ایسا نور عطا فرمایا ہے جو خیر وشر کی معرفت اور ان کے مابین تمیز کی صلاحیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ تَتَّقُوا اللهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ (الأنفال:۲۹)

یعنی: اگر تم اللہ تعالیٰ کا خوف اختیار کرو گے تو وہ تمہیں فرقان عطا فرمائے گا۔

فرقان سے مراد خیر وشر اور نفع وضرر کے درمیان تمیز کرنا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت اپنے متقی بندے کو فرقان کی صلاحیت بخشتا ہے، جس کے ذریعے وہ خیر وشر میں تمیز کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ بعض اوقات مفتیوں کے فتویٰ سے اطمینانِ قلبی حاصل نہیں ہوتا، دل میں ایک تردد سا قائم رہتا ہے، تو چونکہ کوئی شخص معصوم نہیں، ایک عالم سے بھی غلطی کا امکان ہے، اور خاص طور پہ اگر عالم گمراہی اور انحراف کے راستے پر قائم ہو تو وہ عمداً وقصداً ایسے فتوے صادر کرے گا جو شریعتِ مطہرہ کے خلاف ہوں، لہٰذا کسی فتویٰ پر اس وقت تک اعتماد نہ کیجئے جب تک اطمینانِ قلب حاصل نہ ہو جائے۔

اطمینان کا حاصل ہونا اس عمل کے نیک ہونے کی دلیل ہے، اور شک، تنگی اور تردد کا پیدا ہونا اس کے گناہ ہونے کی دلیل ہے۔

کچھ لوگوں کی یہ روش بھی دیکھی گئی ہے کہ وہ اپنے بعض علماء کے اندھے پیروکار بن جاتے ہیں، شیطان ان کے دل میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ ان سے غلطی صادر ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا ہر بات میں ان کی پیروی کو اپنے لئے ضروری قرار دے دیتے ہیں، یہ روش شرعی مقاصد کے خلاف ہے۔

کچھ لوگ اس قدر سست اور کوتاہ ہمت واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی بھی عالم کی ہر بات یہ کہہ کر تسلیم کر لیتے ہیں کہ صحیح یا غلط انہی کے کاندھوں پر ہے اور وہ خود اس مسئلہ کے ذمہ دار ہیں، یہ موقف بھی شرعی ادلہ سے موافقت نہیں رکھتا۔

علماءِ کرام سے استفسار ضرور کیا جائے، ان سے مسئلہ کی دلیل بھی طلب کی جائے، پھر اپنے دل کی طرف رجوع کیا جائے کہ وہ اس مسئلہ پر مطمئن ہے یا نہیں؛ کیونکہ حدیثِ بالا کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے نفس سے بھی فتویٰ طلب کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ کی تحقیق کی تین بنیادیں ہیں:

(۱) علماء سے استفسار

(۲) مسئلہ کی دلیل کا مطالبہ

(۳) بیان کردہ جواب پر دل کا مطمئن ہونا

گویا کسی بھی مسئلہ کی صحت کیلئے صرف اطمینانِ قلبی کافی نہیں، اسی طرح کسی عالم کا بلا دلیل جواب بھی کافی نہیں، بلکہ یہ تینوں مراحل اپنانا ضروری ہیں، خصوصاً اس پرفتن دور میں کہ فتنے سمندر کی لہروں کی طرح اُٹھ رہے ہیں، بارش کے قطروں کی طرح برس رہے ہیں، چٹائی کے تنکوں کی طرح باہم مربوط ہوکر پوری قوت سے حملہ آور ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی موجود ہے، جس میں آپ ﷺ نے ایسے دعاۃ کی خبر دی ہے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہوکر دعوت دیں گے، اور اپنے ماننے والوں کو اسی وقت کھینچ کر جہنم میں جھونک دیں گے۔

قرآن پاک نے بھی ایسے دعاۃ سے متنبہ فرمایا ہے، جو دنیائے دنی کی غلامی کی بدترین روش اپنائے ہوئے ہیں، جن کا ہدف مال وزر کا حصول ہے، جس کے لئے ہر قسم کے فتوے صادر کرنے پر تیار رہتے ہیں، ایسے خواہش پرست عناصر قطعاً اس لائق نہیں کہ انہیں علماء کی صف میں شمار کیا جائے، ان سے اس طرح دوری اور بچاؤ اختیار کیا جائے، جیسے باولے کتے سے اجتناب برتا جاتا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (التوبة: ۳۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اکثر علما اور عابد، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روک دیتے ہیں۔

ثابت ہوا کہ یہ خواہش پرست طبقہ دین کا بھی ڈاکو ہے اور دنیا کا بھی۔

واضح ہو کہ اس حدیث سے صوفیاء کے لئے کوئی دلیل نہیں جن کا انحصار قلبی کشف والہام پر ہے؛ کیونکہ یہ طبقہ وحی الٰہی پر اعتماد کے بجائے اپنے قلبی رجحانات ومیلانات (جنہیں وہ کشف وغیرہ کا نام دیتے ہیں) پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔

حدیث نمبر: ۷

قال الإمام مسلم رحمه الله في كتاب البر والصلة والآداب من صحيحه:

حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة حدثنا سفيان بن عيينة عن بريد بن عبد الله عن جده عن أبي موسى عن النبي (ح) وحدثنا محمد بن العلاء الهمداني واللفظ له حدثنا أبو أسامة عن بريد عن أبي بردة عن أبي موسى عن النبي قال: إنَّما مَثَلُ الجَلِيسِ الصّالِحِ، والْجَلِيسِ السُّوْءِ، كَحامِلِ المِسْكِ، ونافِخِ الكِيرِ، فَحامِلُ المِسْكِ: إمّا أنْ يُحْذِيَكَ، وإمّا أنْ تَبْتاعَ منه، وإمّا أنْ تَجِدَ منه رِيحًا طَيِّبَةً، ونافِخُ الكِيرِ: إمّا أنْ يُحْرِقَ ثِيابَكَ، وإمّا أنْ تَجِدَ رِيحًا خَبِيثَةً. (رقم الحديث: ٢٦٢٨)

ترجمہ:

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیک مصاحب اور بدمصاحب کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی، مشک والا یا تو تجھے یونہی دے گا (تحفہ کے طور پر سونگھنے کے لیے) یا تو اس سے خرید لے گا یا تو اس سے اچھی خوشبو پائے گا اور بھٹی پھونکنے والا یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا یا بری بو تجھ کو سونگھنی پڑے گی۔''

تخریج:

یہ حدیث امام مسلم نے مذکورہ بالا دو سندوں سے روایت کی ہے۔ امام بخاری

رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں دو جگہ روایت فرمایا ہے۔

١ - (كتاب البيوع، باب في العطار و بيع المسك)(رقم الحديث:٢١٠١)

٢ - (كتاب الذبائح والصيد، باب المسك) (رقم الحديث:٥٥٣٤)

جب کہ امام ابوداود نے اس کو حضرت انسؓ سے روایت فرمایا ہے۔

كتاب الأدب (باب من يؤمر أن يجالس) (رقم الحديث:٤٨٢٩)

امام احمد کی مسند میں بھی یہ حدیث دو سندوں سے مذکور ہے۔

سندی نکات:

(۱) دونوں سندوں کے راوی سب کوفی ہیں۔

(۲) دونوں سندوں کے راوی صحاح ستہ کے راویوں میں سے ہیں شیخ مسلم ابوبکر بن ابی شیبہ کے علاوہ کہ ترمذی نے ان کی حدیث نہیں لی ہے۔

(۳) یہ روایت روایت الابناء عن الآباء کی مثال ہے، چنانچہ برید نے اسے اپنے دادا ابو بردہ سے روایت کیا ہے اور ابو بردہ نے اسے اپنے والد ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے۔

(۴) برید بن عبداللہ اپنے نام سے جانے جاتے تھے اور ان کے دادا ابو بردہ اپنی کنیت سے مشہور تھے۔

(۵) برید نامی راوی صحیحین میں صرف ایک ہیں یعنی برید بن عبداللہ۔

حدیث کی تشریح:

دوستی کے نتائج فقط دنیوی معاملات تک ہی میں نہیں ہوتے، بلکہ اس کا بندے کے دین و آخرت پر بھی اثر پڑتا ہے، لہٰذا کسی سے دوستی کرنے سے پہلے رسولِ کریم، رؤف رَّحیم ﷺ کا یہ فرمانِ عظیم لازمی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ ”اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَّنْ یُّخَالِلُ“ یعنی آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے

ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دیکھے کس سے دوستی کر رہا ہے۔ (مستدرک، ج ۵، ص ۳۷۲، حدیث: ۷۳۹۹)

دوستی اور مصاحبت ہمیشہ نیک، صالح اور قرآن وسنت کے احکام پر عمل پیرا ہونے والوں کی ہی اختیار کرنی چاہئے، کیونکہ صحبت اثر رکھتی ہے، اچھے اور بُرے دوست کی مثال اس حدیث پاک سے سمجھئے، چنانچہ فرمانِ مصطفےٰ ﷺ ہے: اچھے برے ساتھی کی مثال مُشک کے اٹھانے اور بھٹی دھونکنے (آگ بھڑکانے) والے کی طرح ہے، مُشک اٹھانے والا یا تجھے ویسے ہی دے گا یا تُو اس سے کچھ خرید لے گا یا اس سے اچھی خوشبو پائے گا اور بھٹی دھونکنے والا یا تیرے کپڑے جلا دے گا یا تُو اس سے بدبو پائے گا۔

یاد رکھئے! اچھے دوست کی ہم نشینی سَعادتِ دارین (دنیا و آخرت کی بھلائی) ہے جبکہ بُرے دوست کی صحبت دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی تباہ کر سکتی ہے۔

چنانچہ حضرت سیّدنا مجاہدؒ سے روایت ہے کہ جب کوئی مَرتا ہے تو اس کے اہلِ مجلس اس پر پیش کئے جاتے ہیں اگر وہ (مرنے والا) اہلِ ذکر سے ہوتا ہے تو ذکر والے، اور اگر کھیل کود والوں میں سے ہوتا ہے تو کھیل کود والے پیش کئے جاتے ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء، ج ۳، ص ۳۲۴، رقم: ۴۱۱۵)

اس روایت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں نیکوکاروں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے تاکہ مرتے وقت اہلِ ذکر کو ملاحظہ کریں تو ہمارے لبوں پر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری ہو۔

اچھے دوست کی پہچان، اچھا دوست اور ہم نشیں کیسا ہوتا ہے اس کے بارے میں دو فرامینِ مصطفےٰ ﷺ ملاحظہ کیجئے:

(۱) اچھا ہم نشیں وہ ہے کہ اس کے دیکھنے سے تمہیں خدا یاد آئے اور اس کی گفتگو سے تمہارے عمل میں اضافہ ہو، اور اس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے۔ (جامع صغیر، ص ۲۴۷، حدیث: ۴۰۶۳)

(۲) اچھا ساتھی وہ ہے کہ جب تو خدا کو یاد کرے وہ تیری مدد کرے اور جب تو بُھولے تو یاد دلا دے۔ (جامع صغیر، ص ۲۴۴، حدیث: ۳۹۹۹)

مٹی بھی اگر چار دن گلاب کے نیچے رہے تو اس سے بھی خوشبو آنا شروع ہو جاتی ہے، اسی طرح اچھے اور برے ساتھی کا آدمی کی طبیعت اور تربیت پر گہرا اثر ہوتا ہے، نیک لوگوں سے دوستی اور تعلق رکھنے والا چاہے کتنا بے عمل کیوں نہ ہو اس کے لیے بالآخر نیکی کی منزل آسان ہو جاتی ہے، اور وہ آہستہ آہستہ بذاتِ خود باعمل اور نیک سیرت انسان بن جاتا ہے اور اگر وہ پہلے سے نیک ہو تو صالحین کی دوستی سے نیکی میں مزید پختگی اور رسوخ پیدا ہوتا ہے، اللہ نہ کرے اگر چاروں طرف بے عمل یا بدعمل دوستوں کا گھیرا ہو تو آدمی ساری زندگی برائی کی دلدل میں دھنسا رہتا ہے، اور باہر نکلنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی، بالآخر ایسا شخص ساری زندگی ہدایت سے محروم رہتا ہے اور عذابِ الٰہی کی پکڑ میں آجاتا ہے۔

حدیث نمبر:۸

قال الإمام مسلمؒ فی کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها من صحیحه:

وحدثنی عبد الرحمن بن بشر بن الحکم العبدی حدثنا یحیی یعنی ابن سعید القطان حدثنا أبو یونس القشیری حدثنا ابن أبی ملکیة عن القاسم عن عائشة عن النبی قال: لیسَ أحَدٌ یُحاسَبُ إلّا هَلَكَ، قُلتُ: یا رَسولَ اللّٰهِ، أَلیسَ اللّٰهُ یقولُ: حِسابًا یَسِیرًا ؟ قالَ: ذاكِ العَرْضُ، ولَكِنْ مَن نُوقِشَ الحِسابَ هَلَكَ.

وفی روایة: مَن نُوقِشَ الحِسابَ هَلَكَ.(رقم الحدیث: ۲۸۷٦)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''روزِ قیامت جس کسی سے حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا، میں نے عرض کیا، کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا: جس کسی کو نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے آسان حساب لیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو صرف پیش کرنا ہوگا، لیکن جس کی حساب میں جانچ پڑتال کی گئی وہ ہلاک ہوگا۔''

تخریج:

یہ حدیث بخاری میں چار جگہ مذکور ہے:

(۱) باب من سمع شيئا فلم يفهمه فراجع فيه حتى يعرفه (رقم الحديث:۱۰۳)

(۲) (باب: فسوف يحاسب حسابا يسيرا)(رقم الحديث:٤٩٣٩)

(۳) (باب:من نوقش الحساب عذب) (رقم الحديث:٦٥٣٦)

(٤) (باب: من نوقش الحساب عذب)(رقم الحديث:٦٥٣٧)

أبو داؤد باب عيادة النساء (رقم الحديث:۳۰۹۳)

سنن الترمذی(رقم الحديث:٢٤٢٦)

سندی نکات:

(۱) دونوں سندوں کے راوی شیخ مسلم عبدالرحمن بن بشر کے علاوہ صحاح ستہ کے راویوں میں سے ہیں۔

(۲) سند میں دو مدنی ہیں یعنی: عائشہ اور ان کے بھتیجے قاسم بن محمد، دو مکی ہیں، یعنی: ابن ابی ملیکہ اور عثمان بن الاسود، اور دو بصری ہیں، یعنی: ابو یونس قشیری اور یحییٰ بن سعید قطان اور ساتواں نیشاپوری ہے جو عبدالرحمن بن بشر شیخ مسلم ہیں۔

(۳) راویوں کے سلسلہ میں ایک راوی اپنے نام اور کنیت دونوں سے مشہور ہے: ابو یونس قشیری، ان کا نام حاتم ابن ابی صغیرہ ہے، ان کو کبھی کنیت اور کبھی اسم سے ذکر کیا جاتا ہے۔

(۴) راویوں کے سلسلہ میں ایک راوی ہے جو مدینہ کے سات فقہاء میں سے ایک ہے، وہ ہیں: قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق۔

(۵) راویوں کے سلسلہ میں تابعین کے طبقے میں سے دو ہیں، یعنی: قاسم بن محمد اور ابن ابی ملیکہ، لہٰذا یہ حدیث ایک تابعی کی روایت دوسرے تابعی سے ہے۔

تشریح:

خدا کے مومن بندے کی صفات میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے ڈرتا ہے اور آخرت میں حساب کی سختی سے ڈرتا ہے، وہ اس حقیقت پر ایمان و یقین رکھتا ہے کہ اسے اس دنیا سے ایک دن کوچ کرنا ہے، اور اللہ کے دربار میں پیش ہونا ہے جہاں اس کا بھرپور حساب لیا جائے گا، اگر اس نے ذرہ برابر بھی نیک عمل کیا ہوگا تو اس کی جزا پائے گا اور اگر اس نے ذرہ برابر بھی برا کام کیا ہوگا تو اس کی سزا بھگتے گا۔

اسی وجہ سے وہ دنیا کو دار فانی اور آخرت کو دار البقاء سمجھتا ہے اور اس کو آباد کرنے کے لیے ہر قسم کی کوشش اور ہمہ قسم کے جتن کرتا ہے، اللہ رب العالمین نے قرآن مجید میں کئی جگہوں پر دنیا کی بے ثباتی بیان فرما کر اسے دھوکے کا سامان قرار دیا ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے:

''تم سب جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا، زیب و زینت، آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا، اور مال و دولت اور اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے، اس کی مثال اس بارش کی ہے جس سے اگنے والی فصل کسانوں کو خوش کر دیتی ہے پھر وہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے'' (حدید: ۲۰)

دنیا کی بے ثباتی کی وجہ سے ہی رسول اکرم ﷺ نے اپنی بے شمار احادیث میں امت کی توجہ آخرت کی طرف دلائی ہے، فرمان نبوی ہے:

''عقل مند آدمی وہ ہے جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور ایسے کام کیے جس کا فائدہ اسے موت کے بعد ملے گا۔'' (بخاری)

دنیا میں صرف موت ہی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کو ہر انسان تسلیم کرتا ہے اور جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے، کافر تو اسے اپنی زندگی کا اختتام سمجھتا ہے، جب کہ مسلمان اسے آخرت کی زندگی میں داخل ہونے کا دروازہ، اور رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا پانے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے: ''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا

جائے گا، تو جو شخص آتش جہنم سے دُور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔'' (آل عمران:۱۸۵)

موت سے کسی کو کوئی مفر نہیں، دنیا میں کوئی ایسی پناہ گاہ نہیں جو انسان کی موت سے حفاظت کر سکے، اہل دنیا نے ہر بیماری کے علاج کے متعلق کافی پیش رفت کی ہے، لیکن موت کے سامنے سب بے بس ہیں:

''تم کہیں بھی رہو موت تو تمہیں آ کر ہی رہے گی خواہ مضبوط سے مضبوط قلعوں میں ہی رہو۔'' (النساء:۷۸)

روئے زمین پر انسانوں میں اگر کسی کو زندہ رہنے کا حق ہوتا تو اس کے سب سے زیادہ مستحق، حبیب رب العالمین، ساقی حوض کوثر، شافع روز محشر، رسول اکرم ﷺ ہوتے، لیکن آپ بھی اس دنیائے رنگ و بو سے رب کی رحمت میں چلے گئے۔

اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''دنیا میں اس طرح رہو جیسے تم اجنبی ہو یا مسافر، صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو، اور شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کر لو، اور اپنی صحت کو غنیمت جان لو اپنی بیماری سے پہلے اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔'' (بخاری)

یعنی دنیا کو وطن نہ بنانا کہ تمہیں اس میں عرصہ دراز تک رہنے کی آرزو پیدا ہو جائے، اس سے صرف اتنا ہی شغف و تعلق رکھنا جتنا کہ ایک اجنبی شخص، جو کہ اپنے اہل وعیال کے پاس لوٹنا چاہتا ہے، اجنبی ملک سے رکھتا ہے، اور ہمیشہ اپنی موت و آخرت کی یاد میں رہنا۔ بقول شاعر:

فکر عقبیٰ کی کر، آج ہی بے خبر
کل نہ کر، کل کا کوئی بھروسہ نہیں

اس لیے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے: ''تم لذتوں کو پاش پاش کرنے والی چیز کو

بکثرت یاد کیا کرو، صحابہ کرامؓ نے کہا: یا رسول اللہ! وہ کونسی چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ موت ہے۔" (متفق علیہ) نیز فرمایا: تم قبرستان کی بار بار زیارت کرو، اس لیے کہ یہ عمل تمہیں موت کی یاد دلاتا ہے" (بخاری)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان کو عبرت حاصل کرنے کے لیے قبرستان سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔

جب انسان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اسے روزِ محشر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے تو وہ دن کا اجالا ہو یا رات کا اندھیرا، کسی کو دھوکہ نہیں دے گا، جھوٹ نہیں بولے گا، بے وفائی نہیں دکھائے گا، اور موجودہ دنیا میں جو کچھ برائیاں ہیں ان سے اپنا دامن بچا کر رکھے گا۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں:

(۱) فکرِ آخرت

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فقاہت۔

(۳) علم میں مذاکرہ کرنا۔

(۴) اچھے سوال پسندیدہ ہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے فضل کا امیدوار رہنا چاہیے۔

(۶) اپنے عمل پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔

حدیث نمبر: ۹

قال الإمام مسلم فی صحیحه کتاب الإیمان باب بَیَانِ عَدَدِ شُعَبِ الْإِیمَانِ وَأَفْضَلِهَا وَأَدْنَاهَا وَفَضِیلَةِ الْحَیَاءِ وَکَوْنِهِ مِنُ الإیمان.

حدثنا زهیر بن حرب، حدثنا جریر، عن سهیل، عن عبد اللّٰه بن دینار، عن ابی صالح، عن ابی هریرة، قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: " الإِیمَانُ بِضْعٌ وسَبْعُونَ، أَوْ بِضْعٌ وسِتُّونَ شُعْبَةً، فأَفْضَلُها قَوْلُ لا إِلَهَ إِلّا اللّٰهُ،

وأدناها إماطةُ الأذى عَنِ الطَّرِيقِ، والْحَياءُ شُعْبَةٌ مِنَ الإيمانِ(رقم الحديث:۳۵)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ: ''ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں، یا فرمایا: ایمان کی ساٹھ سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں جن میں سے سب سے افضل لا الہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے کمتر راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے''۔

تخریج:

(۱) البخاری فی الصحیح، کتاب الإیمان، باب أمور الإیمان.

(۲) مسلم فی الصحیح، کتاب الإیمان، باب بیان عدد شعب الإیمان وأفضلها وأدناها۔

(۳) أبو داود فی السنن کتاب السنة، باب فی ردّ الإرجاء۔

(٤) الترمذی فی السنن، کتاب الإیمان، باب ما جاء فی استکمال الإیمان وزیادته ونقصانه۔

(٥) النسائی فی السنن، کتاب الإیمان وشرائعه، باب ذکر شعب الإیمان.

سندی نکات:

(۱) ابو صالح کا نام ذکوان اور لقب سمان یا زیات ہے، کیوں کہ وہ گھی کی تجارت کرتے تھے۔

(۲) عبداللہ بن دینار اور ابو صالح دونوں تابعی ہیں، لہٰذا یہ حدیث ایک تابعی کی روایت دوسرے تابعی کی مثال ہے۔

(۳) بعض روایات میں بضع وسبعون اور بعض میں بضع وستون ہے، جب کہ بعض میں دونوں کے درمیان شک واقع ہوا ہے، نیز روایات کی ترجیح میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

تشریح:

اس حدیثِ مبارک میں ایمان کی ستر سے زائد شاخوں کا ذکر کیا گیا ہے، اکثر شارحین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ یہاں عدد کے ذکر سے حصر (یعنی کسی خاص تعداد کا تعین) مقصود نہیں ہے بلکہ محاورہ عرب کے مطابق یہ سمجھانا مقصود ہے کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں،" ایمان کے شعبوں سے مراد وہ تمام اعمال واخلاق، ظاہری اور باطنی وہ سب احوال ہیں جو کسی دل میں ایمان کے آجانے کے بعد اس کے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر اس میں پیدا ہو جانے چاہیں جیسے کہ سرسبز وشاداب درخت سے برگ وبار نکلتے ہیں، اس طرح گویا تمام اعمالِ خیر واخلاق حسنہ واحوال صالحہ ایمان کے شعبے ہیں، البتہ ان کے درجات مختلف ہیں، پہلی چیز تو بنیادی ہے یعنی اس حقیقت کا دل ودماغ میں اعتقاد ویقین اور زبان سے اقرار واظہار کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس کی ذات وصفات برحق ہیں، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، بقاء اور دوام صرف اسی کی ذات کے لئے ہے جب کہ کائنات کی تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں، ایسے ہی اللہ کے رسولوں، اس کی کتابوں اور فرشتوں کے بارے میں اچھا اعتقاد اور حسن یقین رکھنا اور ان کو برحق جاننا، آخرت کا عقیدہ رکھنا کہ مرنے کے بعد قبر میں برے اور گنہگار لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اچھے نیک بندوں پر اس کا انعام واکرام ہوتا ہے، قیامت آئے گی اور اس کے بعد حساب وکتاب کا مرحلہ ضرور آئے گا، اس وقت ہر ایک کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے جن کے زیادہ اعمال اچھے اور نیک ہوں گے ان کو پروانہ جنت دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جن کے زیادہ اعمال برے ہوں گے، ان کی فرد جرم ان کے بائیں ہاتھ میں تھمادی جائے گی، تمام لوگ پل صراط پر سے گزریں گے، مومنین صالحین ذات باری تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے، نیک اور اچھے لوگ بہشت میں پہنچائے جائیں گے اور گنہگاروں کو دوزخ میں ڈھکیل دیا جائے گا، جس طرح جنتی (مومن) بندے جنت میں ہمیشہ ہمیش اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام اور اس کی خوشنودی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اسی طرح دوزخی لوگ (کفار) ہمیشہ ہمیش اللہ کے مسلط کئے ہوئے عذاب میں مبتلا رہیں گے، ایمان کے شعبوں اور شاخوں میں سے یہ بھی ہے کہ بندہ اللہ سے ہر وقت لو لگائے رہے اور اس سے محبت

رکھے اگر کسی غیر اللہ سے محبت کرے تو اللہ کے لئے کرے یا کسی سے دشمنی رکھے تو اللہ کے لئے رکھے، رسول اللہ ﷺ سے کامل محبت اور آپ ﷺ کی عظمت و برتری، اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو رواج دینا اور پھیلانا بھی آپ ﷺ سے محبت رکھنے کی دلیل ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اس طرح رچ بس جائے کہ اس محبت کے مقابلہ میں دنیا کی کسی بھی چیز اور کسی بھی رشتہ کی محبت کوئی اہمیت نہ رکھے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی علامت اتباع شریعت ہے، اگر کوئی آدمی اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کی تعمیل کرتا ہے اور شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اللہ، اور رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے، لیکن جو آدمی اللہ اور رسول کے احکام و فرمان کی تابعداری نہ کرتا ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ اس کا دل اللہ و رسول کی پاک محبت سے بالکل خالی ہے۔

یہ بھی ایمان کی ایک شاخ ہے کہ جو عمل کیا جائے خواہ وہ بدنی ہو یا مالی، قولی ہو یا فعلی اور اخلاقی وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے ہو، نام و نمود یا کسی دنیاوی غرض سے نہ ہو، پس جہاں تک ہو سکے اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ نفاق اور ریا کا اثر عمل کے حسن و کمال اور تاثیر کو ختم کر دے گا۔

مومن کا دل ہمہ وقت خوف الٰہی اور خشیت الٰہی سے بھرا ہوا اور اس کے فضل و کرم اور رحمت کی امیدوں سے معمور رہنا چاہیے، اگر بتقاضائے بشریت کوئی بری بات یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر فوراً خلوص دل سے توبہ کے بعد آئندہ کے لئے گناہوں سے اجتناب کا عہد کرے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے اور اپنے اچھے عمل اور نیک کام میں اللہ کی رحمت اور اس کے انعام و اکرام کی آس لگائے رہے، درحقیقت یہ ایمان کا ایک بڑا تقاضہ ہے کہ جب کبھی کوئی گناہ جان بوجھ کر یا نادانستہ سرزد ہو جائے تو فوراً احساس ندامت و شرمندگی کے ساتھ اللہ کے حضور اپنے گناہ سے توبہ کرے اور معافی و بخشش کا طلبگار ہو، اس لئے کہ ارتکاب گناہ کے بعد توبہ کرنا شرعاً ضروری اور لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے، اگر اس نے اولاد عنایت فرمائی ہو

تو فوراً عقیقہ کرے، اگر نکاح کیا ہو تو ولیمہ کرے، اگر قرآن مجید حفظ یا ناظرہ ختم کیا ہو تو خوشی و مسرت کا اظہار کرے، اللہ نے اگر مال دیا ہے تو زکوۃ ادا کرے، عیدالفطر کی تقریب میں صدقۃ الفطر دے اور بقرعید میں قربانی کرے، یہ بھی ایمان کا تقاضہ ہے کہ وعدہ کرے تو اسے پورا کرے، مصیبت پر صبر کرے، اطاعت وفرمانبرداری کے لئے ہر مشقت برداشت کرے، گناہوں سے بچتا رہے، تقدیر اور اللہ کی مرضی پر راضی رہے، اللہ پر توکل کرے، بڑوں اور بزرگوں کی تعظیم واحترام، چھوٹوں اور بچوں سے شفقت ومحبت کا معاملہ کرے اور کبر وغرور، نخوت وتکبر کو چھوڑ کر کسر نفسی وتواضع اور حلم وبردباری اختیار کرے، ''حسن اسلام'' اور ''تکمیل ایمان'' کے مدارج میں سے یہ بھی ہے کہ برابر کلمہ توحید وشہادت کا ورد رکھے، قرآن شریف پڑھے اگر جاہل ہو تو عالم سے علم کی دولت حاصل کرے اگر عالم ہو تو جاہلوں کو تعلیم دے۔ اپنے مقاصد میں کامیابی کے لئے اللہ سے مدد کا طلب گار ہو اور دعا مانگے اور اس کا ذکر کرتا رہے اپنے گناہوں سے استغفار کرے اور فحش باتوں سے بچتا رہے، ہر وقت ظاہری وباطنی گندگیوں سے پاک رہے۔ نمازوں کا پڑھنا خواہ فرض ہوں یا نفل، اور وقت پر ادا کرنا، روزہ رکھنا، چاہے نفل ہو یا فرض، ستر کا چھپانا، صدقہ دینا خواہ نفلی ہو یا لازمی، غلاموں کو آزاد کرنا، سخاوت وضیافت کرنا، اعتکاف میں بیٹھنا، شب قدر اور شب برأت میں عبادت کرنا، حج وعمرہ کرنا، طواف کرنا، دارالحرب یا ایسے ملک سے جہاں فسق وفجور، فحش وبے حیائی اور منکرات و بدعات کا زور ہو، دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جانا، بدعتوں سے بچنا اپنے دین کو بری باتوں سے محفوظ رکھنا، نذروں کا پورا کرنا، کفاروں کا ادا کرنا، حرام کاری سے بچنے کے لئے نکاح کرنا، اہل وعیال کے حقوق پورے طور پر ادا کرنا، والدین کی خدمت کرنا، اور ہر طرح ان کی مدد کرنا اور خبر گیری رکھنا، اپنی اولاد کی شریعت کے مطابق تربیت کرنا اپنے ماتحتوں سے حسن سلوک کرنا اپنے حاکموں، افسروں اور مسلمان سرداروں کی تابعداری کرنا بشرطیکہ وہ خلاف شرع چیزوں کا حکم نہ دیں، غلام اور باندی سے نرمی اور بھلائی سے پیش آنا، اگر صاحب اقتدار اور حاکم وجج ہو تو انصاف کرنا، لوگوں میں باہم صلح صفائی کرانا، اسلام سے بغاوت

کرنے والوں اور دین سے پھرنے والوں سے قتل وقتال کرنا، اچھی باتوں کی تبلیغ کرنا، بری باتوں سے لوگوں کو روکنا، اللہ کی جانب سے مقرر کی ہوئی سزاؤں کا جاری کرنا، دین واسلام میں غلط باتیں پیدا کرنے والوں اور اللہ و رسول کا انکار کرنے والوں سے حسب قوت و استطاعت خواہ ہتھیار سے خواہ قلم و زبان سے جہاد کرنا، اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، امانت کا ادا کرنا، مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرنا، وعدے کے مطابق فرض پورا کرنا، پڑوسی کی دیکھ بھال کرنا اور اس کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا، لوگوں کے ساتھ بہترین معاملہ کرنا، حلال طریقہ سے مال کمانا اور اس کی حفاظت کرنا، مال و دولت کو بہترین مصرف اور اچھی جگہ خرچ کرنا، فضول خرچی نہ کرنا، سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا، جب کسی کو چھینک آئے تو ''یرحمک اللہ'' کہنا، خلاف تہذیب کھیل کود اور برے تماشوں سے اجتناب کرنا، لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا اور راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا تاکہ راہ گیروں کو تکلیف ونقصان نہ پہنچے، یہ سب ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں ہیں، راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کے ہٹانے کا یہ مطلب ہے کہ اگر راستے میں پتھر یا کانٹے پڑے ہوں جس سے راہ گیر کو تکلیف پہنچ سکتی ہو یا نجاست وغلاظت پڑی ہو یا ایسی کوئی بھی چیز پڑی ہو جس سے راستے پر چلنے والوں کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو مومن کا یہ فرض ہے کہ انسانی واخلاقی ہمدردی کے ناطے اس کو ہٹا دے اور راستہ صاف کر دے، اور اسی طرح خود بھی ایسی کوئی چیز راستے میں نہ ڈالے جو راستہ چلنے والوں کے لئے تکلیف کا باعث ہو، اور عارفین کی رمز شناس نگاہوں نے تو اس سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے صاف کر لے جو توجہ الی اللہ اور معرفت کے راستہ کی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں اور اپنے قلب سے برائی ومعصیت کے خیال تک کو کھرچ کر پھینک دے۔

بہرحال یہ تمام باتیں ایمان کے شعبے ہیں جن پر مومن کا عمل کرنا نہایت ضروری ہے اس لئے کہ ایمان کی تکمیل اور اسلام کا حسن ان ہی چیزوں سے پیدا ہوتا ہے اگر کوئی آدمی ان باتوں سے خالی ہے اور اس کی زندگی ان کی شعاعوں سے منور نہیں ہے تو سمجھنا

چاہیے کہ اس کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوئی اس کو چاہیے کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق چاہ کر ان اہم باتوں کو اختیار کرے۔

اس حدیث میں ایمان کا سب سے اعلیٰ شعبہ لا الہ الا اللہ یعنی توحید کی شہادت کو بتلایا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں ادنی درجے کی چیز راستے سے تکلیف پہنچانے والی چیزوں کے ہٹانے کو قرار دیا گیا ہے، اب ان کے درمیان جس قدر بھی امور خیر کا تصور کیا جاسکتا ہے، وہ سب ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں ہیں، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے اور ظاہر ہے کہ ان کا عدد سینکڑوں تک پہنچے گا، اہل ایمان کی نفسیاتی اور روحانی تربیت کے لیے خاص طور پر حیا کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس پر بڑا زور دیا گیا ہے، یہ گویا کہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے، کہا جاتا ہے کہ "اذا فاتك الحياء فافعل ماشئت" جب تیری حیا مر جائے تو، تو جو چاہے کر، ایک حیاء کا مادہ طبیعت میں پیدا ہو جائے تو انسان ہزار ہا خرابیوں اور برائیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، حیا صرف انسانوں سے ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ حیاء تو اللہ رب العزت سے ہونی چاہیے، اس حیا کی وضاحت حضور اکرم ﷺ کے درج ذیل ارشاد سے ہو جاتی ہے: "اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی حیا اس سے کرنی چاہیے" مخاطبین نے عرض کیا، الحمد للہ ہم خدا سے حیا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: یہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگرانی کرو اور پیٹ کی اور جو اس میں بھرا ہے، نگرانی کرو، (یعنی فاسد خیالات اور حرام غذا سے بچو) موت اور موت کے بعد قبر میں تمہاری جو حالت ہونی ہے، اس کو یاد رکھو، جس نے یہ سب کیا، سمجھو کہ اس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کیا۔ (ترمذی)

حدیث: ۱۰

قال الإمام مسلم في باب تحريم الظلم من كتاب البر والصلة والآداب:

حدثنا عبد اللّٰه بن عبد الرحمن بن بهرام الدارمی،حدثنا مروان یعنی ابن محمد الدمشقی، حدثنا سعید بن عبد العزیز، عن ربیعة بن یزید، عن أبی إدریس الخولانی عن أبی ذر عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فِیما رَوی عَنِ اللّٰهِ تَبارَكَ وَتَعالی أَنَّهُ قالَ: یا عِبادِی، إِنِّی حَرَّمْتُ الظُّلْمَ علی نَفْسِی، وَجَعَلْتُهُ بَیْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فلا تَظالَمُوا، یا عِبادِی، كُلُّكُمْ ضالٌّ إِلّا مَن هَدَیْتُهُ، فاسْتَهْدُونِی أَهْدِكُمْ، یا عِبادِی، كُلُّكُمْ جائِعٌ إِلّا مَن أَطْعَمْتُهُ، فاسْتَطْعِمُونِی أُطْعِمْكُمْ، یا عِبادِی، كُلُّكُمْ عارٍ إِلّا مَن كَسَوْتُهُ، فاسْتَكْسُونِی أَكْسُكُمْ، یا عِبادِی، إِنَّكُمْ تُخْطِئُونَ بِاللَّیْلِ والنَّهارِ، وَأَنا أَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیعًا، فاسْتَغْفِرُونِی أَغْفِرْ لَكُمْ، یا عِبادِی، إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوا ضَرِّی فَتَضُرُّونِی، وَلَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِی فَتَنْفَعُونِی، یا عِبادِی، لو أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، كانُوا علی أَتْقی قَلْبِ رَجُلٍ واحِدٍ مِنكُمْ؛ ما زادَ ذلكَ فی مُلْكِی شیئًا، یا عِبادِی، لوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، كانُوا علی أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ واحِدٍ؛ ما نَقَصَ ذلكَ مِن مُلْكِی شیئًا، یا عِبادِی، لو أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قامُوا فی صَعِیدٍ واحِدٍ فَسَأَلُونِی، فأَعْطَیْتُ كُلَّ إِنْسانٍ مَسْأَلَتَهُ؛ ما نَقَصَ ذلكَ ممّا عِندِی إِلّا كما یَنْقُصُ المِخْیَطُ إِذا أُدْخِلَ البَحْرَ، یا عِبادِی، إِنَّما هی أَعْمالُكُمْ أُحْصِیها لَكُمْ، ثُمَّ أُوَفِّیكُمْ إِیّاها، فمَن وَجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَن وَجَدَ غیرَ ذلكَ فلا یَلُومَنَّ إِلّا نَفْسَهُ .وفی روایةٍ: إِنِّی حَرَّمْتُ علی نَفْسِی الظُّلْمَ وعلی عِبادِی، فلا تَظالَمُوا.(رقم الحدیث: ۲۵۷۷)

'قال سعید: كان أبو إدریس الخولانی، إذا حدث بهذا الحدیث، جثا علی ركبتیه'

ترجمہ:

حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے، جو وہ اپنے رب تعالیٰ سے روایت فرماتے ہیں، بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اے میرے بندو! بے شک میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام کیا ہوا ہے، اور اسے تمہارے لئے بھی آپس میں حرام قرار دیتا ہوں، پس تم ظلم نہ کرو۔

اے میرے بندو! تم سب کے سب گمراہ ہو، مگر جسے میں ہدایت دوں، پس صرف مجھ ہی سے ہدایت طلب کرو، میں ہی تمہیں ہدایت دوں گا۔

اے میرے بندو! تم سب کے سب بھوکے ہو، مگر جسے میں کھلاؤں، پس مجھ ہی سے کھانا طلب کرو، میں سب کو کھلاؤں گا۔

اے میرے بندو! تم سب کے سب برہنہ ہو، مگر جسے میں لباس پہناؤں، پس مجھ سے ہی لباس طلب کرو، میں ہی تمہیں لباس پہناؤں گا۔

اے میرے بندو! بلاشبہ تم سب کے سب دن رات گناہ کرتے ہو، اور میں ہی تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہوں، پس مجھ سے استغفار کرو، میں ہی تمہارے گناہوں کو معاف کرونگا۔

اے میرے بندو! اگر تمہارے تمام اگلے اور پچھلے اور تمام انسان وجن، ایک سب سے بڑے متقی انسان کے دل کا روپ دھار لیں تو میری بادشاہت میں کچھ اضافہ نہ کر سکیں گے۔

اے میرے بندو! اگر تمہارے تمام اگلے اور پچھلے اور تمام انسان وجن، ایک سب سے بڑے فاسق وفاجر انسان کے دل کا روپ دھار لیں، تو میری بادشاہت میں سے کچھ کمی نہ کر سکیں گے۔

اے میرے بندو! اگر تمہارے تمام اگلے اور پچھلے اور تمام انسان وجن، ایک میدان میں جمع ہو کر بیک وقت مجھ سے (جو چاہیں) مانگنے لگیں، اور میں اسی وقت سب کا سوال پورا کر دوں تو میرے خزانوں میں اتنی کمی بھی واقع نہیں ہوگی، جو سوئی کے سمندر میں ڈبو کر نکالنے سے، اس سمندر میں واقع ہوتی ہے۔

اے میرے بندو! تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لئے شمار کر رہا ہوں، پھر ان اعمال کا تمہیں پورا پورا بدلہ دونگا، لہٰذا جو شخص اپنے اعمال میں نیکیاں پاتا ہے وہ خوب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے، اور جو شخص برائیاں پاتا ہے وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے۔

تخریج:

اس حدیث کو امام مسلمؒ نے چار طرق سے نقل فرمایا ہے۔ ایک طریق اوپر مذکور ہوا، دیگر مندرجہ ذیل ہیں:

۲- حدثنيه أبو بكر بن إسحاق، حدثنا أبو مسهر، حدثنا سعيد بن عبد العزيز، بهذا الإسناد، غير أن مروان أتمهما حديثا

۳- قال أبو إسحاق: حدثنا بهذا الحديث الحسن، والحسين، ابنا بشر، ومحمد بن يحيى، قالوا: حدثنا أبو مسهر، فذكروا الحديث بطوله

٤- حدثنا إسحاق بن إبراهيم، ومحمد بن المثنى، كلاهما عن عبد الصمد بن عبد الوارث، حدثنا همام، حدثنا قتادة، عن أبي قلابة، عن أبي أسماء، عن أبي ذر، قال: قال رسول اللّٰهِ ﷺ: فيما يروى عن ربه تبارك وتعالى "إني حرّمت على نفسي الظلم وعلى عبادي، فلا تظالموا" وساق الحديث بنحوه، وحديث أبي إدريس الذي ذكرناه أتم من هذا

نیز یہ حدیث مندرجہ ذیل مصادر میں بھی موجود ہے:

۱- مسند أحمد (۳۵/ ۳۳۲ ط الرسالة): (رقم الحديث: ۲۱٤۲۰)

۲- ((سنن ابن ماجه))(٥/ ۳۲٥ ت الأرنؤوط) (رقم الحديث:٤۲٥۷)

۳- ((سنن الترمذي)) (٤/٦٥٦ ت شاكر):(رقم الحديث:۲٤۹٥)

٤- ((السنن الكبرى-البيهقي))(٦/ ١٥٤ ط العلمية): (رقم الحديث:۱۱٥۰۳)

صحابی کے متعلق:

حضرت ابوذر جندب بن جنادہؓ ان کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا: "ما أظلت الخضراء ولا أقلت الغبراء من ذي لهجة أصدق من أبي ذر" یعنی زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حضور ﷺ

کو اسلام کا سلام کیا، یعنی السلام علیکم کہا، آپ اسلام سے پہلے بھی بت پرستی سے اجتناب کرتے تھے، اور ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت اپنے طور پر کرتے تھے، آپ اسلام قبول کرنے میں سابقین اولین میں سے ہیں، چوتھے یا پانچویں نمبر پر آپ نے اسلام قبول کیا۔

آپ سے مروی احادیث کی تعداد:

آپ سے کل دوسو اسی احادیث مروی ہیں، جن میں بارہ متفق علیہ ہیں، اور دو احادیث وہ ہیں جن کو صرف بخاری نے روایت کیا ہے مسلم نے نہیں جب کہ انیس وہ ہیں جن کو مسلم نے روایت کیا ہے بخاری نے نہیں۔

آپ کا انتقال مقام ربذہ میں سن ۳۲ ہجری میں ہوا، آپ کی نماز جنازہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

سندی نکات:

۱- اس حدیث کی تخریج میں امام مسلمؒ امام بخاریؒ سے منفرد ہیں۔

۲- یہ حدیث حدیث قدسی ہے۔

حدیثِ قدسی کی تعریف:

جس حدیث کو رسول اللہ ﷺ اپنے رب تعالیٰ کی طرف منسوب فرمادیں، اسے حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے، تو گویا حدیثِ قدسی ہر وہ حدیث ہے، جسے رسول اللہ ﷺ اپنے رب عزوجل سے روایت فرمائیں۔

قرآن وحدیث دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، ﴿وأنزَلَ اللّٰهُ عَلَيكَ الكِتَابَ وَالحِكْمَةَ﴾ ﴿وَمَايَنطِقُ عَنِ الهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ "ألا إني أوتيتُ القرآنَ ومثله معه"

مگر حدیث قدسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اس کی تشریف وتکریم کا مظہر ہے، اس بارہ میں علماء کی مختلف آراء ہیں کہ حدیثِ قدسی کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، یا رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں، راجح قول یہی ہے کہ حدیثِ قدسی کا معنی، اللہ تعالیٰ

کی طرف سے، اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں۔

حدیثِ قدسی کا قرآن مجید سے یہی فرق ہے کہ قرآن مجید لفظاً و معنیً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، جبکہ حدیثِ قدسی، معناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں۔

حدیثِ قدسی کا دیگر احادیث سے فرق یہ ہے کہ عام احادیث قولاً یا فعلاً رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوتی ہیں، جبکہ حدیثِ قدسی کو، رسول اللہ ﷺ اپنے رب تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے روایت فرماتے ہیں، اس نسبت میں حد درجہ کی تشریف ہے اور پوری کائنات میں یہ سب سے پاکیزہ سند ہے کہ اکرم الاولین والآخرین، اللہ تعالیٰ رب العالمین والٰہ العالمین سے براہِ راست روایت فرما رہے ہیں۔

اس لحاظ سے حدیثِ قدسی بہت زیادہ لائقِ توجہ اور متقاضی اہتمام ہے، اور ممکن ہے اسی وجہ سے تابعی ابوادریس الخولانی سے اس حدیث کی روایت کا تقاضہ کیا جاتا تو وہ دوزانو بیٹھ کر سنایا کرتے۔

۳- امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ اہل شام کی روایت کردہ احادیث میں یہ حدیث سب سے زیادہ مہتم بالشان حدیث ہے، "هو أشرف حديث لأهل الشام"

۴- اس حدیث کے تمام راوی دمشقی ہیں، ابوذر غفاریؓ بھی دمشق تشریف لائے تھے، لہٰذا اس کو حدیث مسلسل بالدمشقیین کہا جا سکتا ہے۔

حدیث کی تشریح:

یہ حدیث بڑی عظیم الشان ہے، اس کے لفظ لفظ سے عظمت و جلال ٹپکتا ہے، اسی لئے حضرت ابوادریس خولانی اس کو بیان کرتے تو ان پر عجیب ہیبت طاری ہو جاتی، اور وہ رعب کی وجہ سے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے، ساتھ ہی اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت و شفقت بھی نمایاں ہے، کس پیار سے وہ اپنے بندوں سے مخاطب ہے اور فرماتا ہے: اے میرے

بندو! تم کو جو بھی مانگنا ہے مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا، آپ نے یقیناً یہ محسوس کرلیا ہوگا کہ اس حدیث کے دس جملے ہیں اور ہر جملے کا آغاز ایک بہت ہی محبت بھرے خطاب سے ہوتا ہے: یعنی: 'یا عبادی!' "اے میرے بندو!" اس خطاب کا بالتکرار آنا اسی حدیث کا خاصہ ہے، اس خطاب میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے بڑا پیار جھلکتا ہے، جس سے حدیث کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جاتی ہے، اور حدیث مزید توجہ واہتمام کا تقاضا کرتی ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے (عبادی) کا لفظ ہمیشہ اسی محبت وتکریم کی غمازی کرتا ہے، بطورِ نمونہ چند آیاتِ کریمہ پیش خدمت ہیں:

(۱) ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الحجر:۴۹)

ترجمہ: میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہوں۔

(۲) ﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ﴾ (الشعراء:۵۲)

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو نکال لے چل تم سب پیچھا کیے جاؤ گے۔

(۳) ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا﴾ (الاسراء:۶۵)

ترجمہ: میرے سچے بندوں پر تیرا کوئی قابو اور بس نہیں، تیرا رب کارسازی کرنے والا کافی ہے۔

(۴) ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ (الانبیاء:۱۰۵)

ترجمہ: ہم زبور میں پند ونصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے (ہی) ہوں گے۔

(۵) ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۸۶)

ترجمہ: جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول

کرتا ہوں اس لئے لوگوں کو بھی چاہئے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں، یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے۔

(۶) ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الزمر:۵۳)

ترجمہ: (میری جانب سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔

نیز اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد اخذ کئے جاسکتے ہیں:

۱ - اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں فرماتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ عدل بلکہ اپنے فضل کا معاملہ فرماتا ہے۔

۲ - ظلم اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، اور ظالم پر اللہ تعالیٰ خفا ہوتا ہے۔

۳ - ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔

۴ - رزق کے اور تمام خیر کے خزانے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

۵ - بندوں کی طاعت سے اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس میں بندوں کا اپنا فائدہ ہے۔

۶ - اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلے بندوں کے اعمال کے مطابق ہوتے ہیں۔

۷ - اللہ تعالیٰ کے خزانے لامحدود ہیں۔

۸ - اللہ کی ذات غنی ہے، وہ بے نیاز آقا ہے۔